مارچ
۲۰۱۱ء

اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ

ماہنامہ

البرہان

لاہور

مدیر: ڈاکٹر محمد امین

ماہنامہ
البرہان
جلد ۱۹، شمارہ ۳ مارچ ۲۰۱۱ء/ ربیع الثانی ۱۴۳۲ھ

مشمولات

O حالات حاضرہ

امریکی غلامی سے نجات کی واحد راہ	مدیر	۲
اہلِ مغرب کا اخلاقی دیوالیہ پن		۴
ہم سب مجرم ہیں	توفیق بٹ	۵

O مقالۂ خصوصی

پاکستانی معاشرے کا بحران اور اس کا حل	ڈاکٹر محمد امین	۷

O تعلیم و تربیت

ایک نئے رول ماڈل تعلیمی ادارے کی ضرورت	مدیر	۱۹
اسلامی تعلیم کا خاکہ	عطاء محمد جنجوعہ	۳۱

O تزکیۂ نفس

حسنِ معاشرت	علامہ احمد جاوید	۳۵
نفاق (منافقت) کی حقیقت اور علاج	علامہ احمد جاوید	۳۸

O مسلم نشأۃ ثانیہ اور مغرب

مسلم ترقی کے لیے سائنس و ٹیکنالوجی غیر اہم ہے	ڈاکٹر نعمان ندوی	۴۱
مسلمانوں کی ترقی کا واحد راستہ	ڈاکٹر محمد امین	۴۶

O تعارف کتاب

مسلمانوں کی ترقی کا ہزار سالہ عروج	پروفیسر ارشد جاوید	۵۳

امریکی غلامی سے نجات کی واحد راہ

ریمنڈ ڈیوس کی رہائی صدمہ، مایوسی، غصہ، نفرت، انتقام ہمیں سمجھ نہیں آتی اپنے جذبات کا اظہار کیسے کریں؟ ہماری پوری اشرافیہ ــــ سیاستدان، انتظامیہ، عدلیہ، میڈیا، فوج۔۔۔سب بِک چکی کیا ہم میر جعفر اور میر صادق کی اولاد ہیں؟ ہمیں یہ سوچ کر اپنے آپ سے گِھن آنے لگتی ہے کہ ہم وہ قوم ہیں جو امریکی غلامی اور استعمار کی ویوٹی پر قانع ہوچکی اور جو لوگ غلامی پہ قانع ہوجائیں کیا وہ مسلمان ہوتے ہیں؟ بلکہ کیا وہ انسان ہوتے ہیں؟ یا ایک ریوڑ جسے جدھر چاہے ہانک لیا جائے! کھرلی پہ بندھے جانور جنہیں زندہ رہنے اور کام کرنے کے لیے چارہ چاہیے۔۔۔اور بس۔۔۔نہ سوچنے سمجھنے اور اظہار کی صلاحیت، نہ کوئی نظریہ، نہ کوئی آئیڈیلز، نہ کوئی ترجیحات۔۔۔ **انا للہ و انا الیہ راجعون۔**

غیرت وعزت سے زندہ رہنے کی ہمیں تو ایک ہی صورت نظر آتی ہے اور وہ یہ کہ پوری قوم اٹھ کھڑی ہو اور امریکی غلامی سے نجات کی خواہاں دینی اور سیاسی جماعتیں اور سول سوسائٹی کے سارے طبقات خصوصاً صحافی، طلباء، وکلاء، اساتذہ، ڈاکٹرز، انجینئرز۔۔۔امریکی غلامی سے نجات اور قومی خود مختاری کے تحفظ کے ایک نکاتی ایجنڈے پر جمع ہوجائیں اور ایسی پُر زور تحریک چلائیں جو امریکہ اور اس کی غلامی قبول کرنے والوں کو بہا کر لے جائے۔

(۲)

مندرجہ بالا مختصر جذباتی تحریر ریمنڈ ڈیوس کی رہائی سے پیدا ہونے والے تموج کے دنوں میں لکھی گئی لیکن البرہان چونکہ ہر مہینے کی آخری تاریخوں میں پریس جاتا ہے لہٰذا اس موضوع پر مزید سوچنے اور غور کرنے کا موقع مل گیا۔

ٹھنڈے دل سے سوچنے کے باوجود ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ یہ بات، اگرچہ تلخ ہے اور صدمے کی ہے، لیکن ہے سچی کہ ہماری اشرافیہ امریکہ کے آگے بک چکی یا اس بکنے پر راضی ہوچکی بالخصوص ہماری سیاسی قیادت پیپلز پارٹی، مسلم لیگ (ن وق وغیرہ)۔ اے این پی، متحدہ، جے یو آئی۔۔۔سب ــــ باستثناء جماعت اسلامی اور عمران خان کی تحریک انصاف (اگرچہ خان صاحب کے بارے میں بھی بعض ناگفتنیاں سننے میں آرہی ہیں لیکن بہرحال ابھی تک وہ اپنے امریکہ مخالف

مؤقف پر بظاہر قائم ہیں)۔میڈیا مالکان اور بڑے اینکرز کے دام لگنے کے بارے میں خود میڈیا کے حلقوں سے تفصیلات مسلسل باہر آرہی ہیں اور ان کے چینلز اور اخبارات کا رویہ ان باتوں کی صداقت کا شاہد ہے۔فوج وہی کررہی ہے جو امریکہ چاہتا ہے۔عدلیہ اور بیوروکریسی کی تربیت ہی مغربیت اور سیکولرزم کے خطوط پر ہوئی ہے۔۔۔رہے نام اللہ کا۔

قوم اور سول سوسائٹی کا یہ حال ہے کہ قوم دو دفعہ سڑکوں پر آئی (ایوب خان اور بھٹو کے خلاف) لیکن دونوں دفعہ اسے کچھ نہیں ملا لہٰذا اب لوگ بے حس ہوگئے ہیں۔غریب لوگ دو وقت کی روٹی کے چکر میں ایسے پھنسے ہیں کہ انہیں کسی بات کی ہوش نہیں۔ بلاشبہ سوسائٹی کے سارے طبقات میں ایسے لوگ موجود ہیں جو اس صورت حال کو سمجھتے ہیں اور امریکہ اور اس کے گماشتوں اور حمایتیوں اور ان کی کرپشن اور دینی قدروں کی پامالی پر آزردہ بھی ہیں لیکن وہ متفرق و منتشر ہیں اور کوئی قابل اعتماد سیاسی و دینی قیادت موجود نہیں جو انہیں مجتمع اور متحرک کرے۔اور یہ بھی ظاہر ہے کہ بچی کھچی صحیح الفکر قیادت (مثلاً جماعت اسلامی یا عمران خان) میں سے انفرادی طور پر کوئی اتنا طاقتور نہیں کہ اپنے بل بوتے پر امریکہ مخالف تحریک چلا سکے۔یوں کہا جا سکتا ہے کہ قوم میں امریکہ مخالف جذبات موجود ہیں لیکن ان کو نکاسی کا کوئی رستہ نہیں مل رہا۔

لہٰذا اب بچنے کی ایک ہی صورت ہے کہ بچی کھچی صحیح الفکر سیاسی و دینی قیادت اسلام اور مسلم دشمن امریکی استعمار کی غلامی سے نجات اور قومی خودمختاری کے تحفظ کے ایک نکاتی ایجنڈے پر فوراً مجتمع ہوکر تحریک چلانے کا اعلان کردے۔ اس طرح سول سوسائٹی کے ہر طبقے کے صحیح الفکر لوگ اس تحریک میں جمع ہوجائیں گے اور کمزور و بے رائے لوگ بھی بتدریج اس میں شامل ہوتے جائیں گے اور بہت جلد یہ تحریک زور پکڑ کر نتیجہ خیز ہوجائے گی، ان شاء اللہ۔لیکن یاد رہے کہ اس دفعہ تحریک کے نتائج وثمرات عوام تک پہنچنے چاہئیں اور سچ مچ انقلاب آنا چاہیے اور اس کے لیے ساتھ ساتھ ہوم ورک ہونا چاہیے اور تھنک ٹینک قائم ہونے چاہئیں۔

اور یہ سب کچھ فوراً کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ دشمن طاقتور ہے، منظم ہے اور حملہ آور ہے۔اگر خدانخواستہ اس کا راستہ نہ روکا گیا تو جو آوازیں آج اٹھ رہی ہیں وہ بھی خاموش کردی جائیں گی اور پھر شاید ایسی تحریر بھی آپ کو پڑھنے کو نہ ملے ـــــ اور یہ اس زلزلے اور طوفان سے بڑا المیہ ہوگا جن کا مزا قدرت ہمیں حال ہی میں چکھا چکی ہے تاکہ ہم سنبھل جائیں۔تو کیا ہم سنبھلیں گے؟ (محمد امین)

اہل مغرب کا اخلاقی دیوالیہ پن

ٹیری جونز

امریکہ کے ایک قصبے کے چھوٹے سے چرچ کا ایک پادری جسے قرآن دشمنی کا کریز ہے، شاید وہ شہرت کا بھوکا ہے یا نفسیاتی مریض ہے۔ اس نے اعلان کر کے اور دنیا کو دکھا کے قرآن جلایا۔ ہم مسلمانوں کے لیے تو یہ صدمے اور اشتعال کی بات ہے ہی، ہم پوچھتے ہیں امریکہ و یورپ کے نام نہاد 'مہذب' افراد سے کہ کیا یہ عدم رواداری اور عدم برداشت کا وہی رویہ نہیں جس کے نہ ہونے کا تم ہمیں الزام دیتے ہو کہ مسلمان غیر مہذب اور جاہل ہیں، انتہا پسند اور دہشت گرد ہیں لہٰذا ان میں رواداری اور برداشت کا مادہ نہیں۔ ہم کہتے ہیں آئینہ دیکھو کہ تم کیا ہو؟ اور تمہارے ٹیری جونز کیا ہیں؟

اور اب لیبیا

لیبیا کا قذافی واقعی آمر ہے اور اپنے خلاف اٹھنے والے لوگوں پر اس کا تشدد واقعی جرم ہے اور ہم اس کی مذمت کرتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ امریکہ و یورپ کو کیا تکلیف ہے کہ وہ لیبیا پر حملے کر رہے ہیں اور قذافی کا اقتدار ختم کر کے خود وہاں کے تیل پر قابض ہونا چاہتے ہیں اور وہاں اپنے ایجنٹوں کی حکومت بنانا چاہتے ہیں؟ یہ اقوام متحدہ کیوں امریکہ کی لونڈی بنی ہوئی ہے کہ امریکی خواہشات سر نیچا کر کے پوری کرتی جا رہی ہے؟

افسوس! امت مسلمہ سوئی ہوئی ہے! او آئی سی گہری نیند میں ہے۔ ۵۷ مسلم ممالک کے حکمران امریکہ کے آگے سر اٹھا کے بات کرنے کی ہمت نہیں رکھتے۔ یہ زنخے ایک ایک کر کے پٹتے جا رہے ہیں۔ پہلے عراق پھر افغانستان اور اب لیبیا اور پاکستان لیکن نہ کسی کی حمیت جاگتی ہے نہ غیرت۔

تفو بر تو اے چرخ گردوں تفو۔

توفیق بٹ

ہم سب مجرم ہیں

ریمنڈ ڈیوس کے حوالے سے جو کچھ ہمارے ساتھ ہوا ہونا ہی تھا۔ پورے پروٹوکول کے ساتھ چند یوم کے لیے اسے جیل میں رکھنے کا ڈرامہ بھی امریکہ نے خود ہی کروایا ہوگا، پاکستان کے ''غیور عوام'' کو احساس دلانے کے لیے کہ ہم آپ کو کسی بھی قیمت پر خرید سکتے ہیں اور اگر دیت والی بات ''سرکاری مؤقف'' کی بجائے حقیقت ہے تو پھر مجھے ایک واقعہ یاد آتا ہے جب ایک ملک کے ''نیشنل ڈے'' کے حوالے سے منعقدہ ایک تقریب میں اس وقت کے امریکی سفیر تشریف لائے تو وہاں موجود ایک پاکستانی سیاستدان نے ان سے کہا'' آپ نے دیکھا باہر سڑکوں پر ہمارے کچھ لوگ آپ کے ملک کے خلاف احتجاج کر رہے ہیں اور آپ کا قومی پرچم جلا رہے ہیں۔'' ایک طنزیہ سی مسکراہٹ امریکی سفیر کے ہونٹوں پر پھیل گئی اور اس نے الٹا سوال کر دیا'' جی ہاں میں نے دیکھا اور سوچا ابھی یہاں کھڑے ہو کر آپ کے لوگوں کو امریکی ویزوں کی پیشکش کروں اور ان سے کہوں اس کے بدلے میں آپ پاکستانی پرچم جلا دیں تو آپ کے خیال میں کتنے لوگ میری اس پیشکش کا احترام نہیں کریں گے؟'' پاکستانی سیاستدان کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا اور آج امریکہ نے ایک بار پھر ثابت کر دیا کہ اس کا کوئی جواب نہیں ہے۔ ظاہر ہے ایسا ہی ہونا تھا اور اس کے ذمہ دار صرف حکومت، بکاؤ سیاستدان اور پاکستان کے ''نیک نام اور مؤقر ادارے'' ہی نہیں عوام بھی ہیں۔ جی ہاں! لہک لہک کر ''اس پرچم کے سائے تلے ہم ایک ہیں ہم ایک ہیں'' اور ''میں بھی پاکستان ہوں تو بھی پاکستان ہے'' جیسے ملی نغمے گانے والے عوام، پاکستان کے بکاؤ سیاستدانوں کو بار بار منتخب کرنے والے عوام۔ اپنے ملک کی عزت کو نیلام ہوتا ہوا دیکھ کر منہ پرے کرنے والے عوام، صرف اور صرف پاپی پیٹوں کے دوزخ بھرنے کے لیے زندہ رہنے کا جذبہ رکھنے والے عوام۔۔۔سو جناب عرض یہ ہے جیسی قوم ہوگی ویسے ہی اس کے حکمران بھی ہوں گے۔ ریمنڈ ڈیوس کی رہائی سقوط ڈھاکہ سے کم سانحہ نہیں مگر اٹھارہ کروڑ عوام میں سے کتنے ہیں جنہوں نے اس سانحے پر پُرزور انداز میں اپنا احتجاج ریکارڈ کروایا؟ کتنے ہیں جو سڑکوں پر آئے؟ چند لاکھ بھی نہیں ہوں گے اور اگر صورت حال جوں کی

توں رہی تو پاکستان اور پاکستانیوں کو مکمل طور پر امریکہ کے سپرد کرنے کے جذبے سے سرشار حکمران اپنے مشن میں کیوں کامیاب نہیں ہوں گے؟ چوروں اور چوکیداروں کا گٹھ جوڑ کیا رنگ لائے گا؟ پاکستان کی اٹھارہ کروڑ بھیڑ بکریوں کو کبھی اس کا احساس ہوگا یا نہیں؟ اور ہوگا تو کب ہوگا جب گلشن مکمل طور پر برباد ہوجائے گا؟۔۔۔ اور میڈیا مجھے معاف کرے تو عرض کروں ریمنڈ ڈیوس کے حوالے سے اس نے بھی اپنی آنکھیں اس طرح کھلی نہیں رکھیں جیسے رکھنے کا حق تھا۔'' بکاؤ سیاسی حکمران'' میڈیا کو اور قسم کے کاموں میں مصروف رکھنے کی سازش میں کامیاب ہوگئے۔ میڈیا نے اپنی توجہ لوٹا سازی اور روایتی قسم کے سیاسی جھگڑوں پر مرکوز کرلی اور ملک دشمن قوتیں اپنے مشن میں کامیاب ہوگئیں۔ سو اب تمام تر خوبیوں اور ذمہ داریوں کی ادائیگی کے باوجود میڈیا کے کردار پر بھی انگلی ضرور اٹھے گی اور میڈیا کو اس کا ازالہ کرنا پڑے گا ورنہ ریمنڈ ڈیوس کیس کے حوالے سے تاریخ میں میڈیا کو بھی کوئی زیادہ اچھے الفاظ سے یاد نہیں رکھا جائے گا۔ اس کیس نے پاکستان کے بکاؤ سیاسی حکمرانوں کے ساتھ کچھ مؤقر اداروں کی عزت اور آزادی کے بھرم بھی کھول کر رکھ دیے۔ سو ہم تو کچھ کہنے کی ہمت نہیں رکھتے مگر عدالتی حکمرانوں کے کانوں میں حکمران جماعت کے ایک صوبائی وزیر کی آواز تو ضرور پڑی ہوگی کہ ''ریمنڈ ڈیوس کو اس عدلیہ نے رہا کیا جس سے ہمیں بھی شکایات ہیں''۔ اب اس حوالے سے عدلیہ کے کردار پر بھی انگلیاں اٹھیں گی۔ بہرحال مبارک ہو پاکستان کے ''بہادر سپاہی حکمرانوں'' کو جنہوں نے ایک بار پھر اس تاثر کو مضبوط کردیا کہ ۲۰۰۸ء کے انتخابات کے نتیجے میں پاکستان میں حکومت نہیں امریکی غلاموں کی شفٹ تبدیل ہوئی تھی۔ ریمنڈ ڈیوس کو لے جانے کے فوراً بعد امریکہ نے ڈرون حملوں کے ذریعے ۸۱ بے گناہ پاکستانیوں کو شہید کرکے پاکستان میں اپنے غلاموں کو جو سلامی پیش کی اس پر بھی وہ مبارک باد کے مستحق ہیں (بشکریہ نوائے وقت)۔

مقالۂ خصوصی		ڈاکٹر محمد امین

پاکستانی معاشرے کا بحران اور اس کا حل

پاکستانی معاشرہ اس وقت جس سیاسی، معاشی، اخلاقی اور معاشرتی بحران کا شکار ہے اس کے اسباب و وجوہات پر غور ضروری ہے تا کہ اصلاح احوال کی کوئی صورت نکل سکے۔ فرمایا ہادیٔ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہ اللہ نے کوئی بیماری ایسی پیدا نہیں کی جس کا علاج نہ پیدا کیا ہو لہٰذا یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہدایت اور فراست کی روشنی میں جسد ملت کو لاحق سیاسی، معاشی، اخلاقی اور معاشرتی بیماریوں کے اسباب و مظاہر پر غور کریں تا کہ ان کا صحیح اور مؤثر علاج دریافت کیا جا سکے۔ اس موضوع پر اگر ہم منطقی انداز میں غور کریں تو گفتگو کی ترتیب یہ بنتی ہے:

۱۔ کیا پاکستانی معاشرہ سچ مچ بحران کا شکار ہے؟

۲۔ اگر ہے تو اس کے اسباب کیا ہیں؟

۳۔ اور اس بحران کا حل کیا ہے؟

جسد ملت کو لاحق بیماریوں کے علاج کے حوالے سے گفتگو کے آغاز ہی میں ہم اپنے غور کرنے کے اسلوب کا ذکر کرنا چاہیں گے کہ حقیقی، مؤثر اور دیرپا علاج کے لیے مرض کے حقیقی اسباب تک پہنچنا اور ان کا علاج کرنا ضروری ہوتا ہے نہ کہ محض فوری علامتوں اور تکالیف (symptoms) کا علاج کر دینا مثلاً اگر کسی آدمی کو سر درد ہو تو پیناڈال یا اسپرین اس کا کوئی علاج نہیں، یہ تو محض دفع الوقتی ہے اور اگر اصل سبب کو دور نہ کیا جائے تو چند گھنٹوں بعد درد دوبارہ شروع ہونے کا امکان غالب ہوتا ہے۔ اور جیسا کہ ہم میں سے اکثر جانتے ہیں کہ سر درد کے متعدد اسباب ہو سکتے ہیں مثلاً بخار، زکام، معدہ خراب ہونا، نیند پوری نہ ہونا، زیادہ رونا، قبض، دماغی مشقت، پریشانی، میگرین ۔۔۔ وغیرہ تو جب تک اصل سبب دور نہ کیا جائے محض عارضی علامتیں ختم ہونے سے بیماری جڑ سے نہیں جاتی۔

اس اصول کا اطلاق اگر ہم پاکستانی معاشرے پر کریں تو بلاشبہ کرپشن، مہنگائی، بیروزگاری، نااہل حکمران، امریکہ کا سیاسی غلبہ، خودکش حملے، ٹارگٹ کلنگ، چوری، ڈاکے، کم شرح تعلیم، میڈیا کی عریانی و فحاشی ۔۔۔ غرض ایسے بہت سے مسائل، تکالیف اور بیماریاں ہیں جو پاکستانی معاشرے کو لاحق ہیں۔ اگر ہم سطحی انداز میں غور کریں تو مثلاً مہنگائی کا علاج یہ معلوم ہوتا ہے کہ چیزیں سستی کر دی

جائیں لیکن حکومت عملاً ایسا کر نہیں سکتی۔ پنجاب حکومت نے تھوڑے عرصے کے لیے روٹی سستی کی تھی لیکن اس پر قائم نہ رہ سکی کیونکہ مہنگائی کے اسباب گہرے ہیں اور ان کے پیچھے بظاہر نظر نہ آنے والے ایسے عوامل موجود ہیں جن کو دور نہیں کیا جا سکتا مثلاً بجلی مہنگی ہوگئی کیوں مہنگی ہوئی؟ اس لیے کہ آئی ایم ایف نے یہ مطالبہ کیا کہ اس پر سبسڈی (subsidy) ختم کردی جائے؟ آئی ایم ایف نے یہ مطالبہ کیوں کیا؟ اس لیے کہ آپ اس سے قرض لینے گئے؟ آپ اس سے قرض لینے کیوں گئے؟ اس لیے کہ آپ کے پاس ملک چلانے کے لیے پیسے نہ تھے؟ پیسے کیوں نہیں تھے؟ وہ کرپٹ حکمران اور انتظامیہ کھا گئی؟ کیوں کھا گئی؟ حرص اور ہوس کی وجہ سے، حلال وحرام کی تمیز نہ کرنے کی وجہ سے، آخرت کا خوف نہ ہونے کی وجہ سے۔ یہ بھی سوچیے کہ آئی ایم ایف کے یہودی مالکان اور امریکہ نے آپ کو قرض کیوں دیا؟ تاکہ وہ آپ سے سود وصول کرے؟ آپ کو قرضوں میں جکڑے، آپ کی معاشی پالیسیاں کنٹرول کرے، آپ کے کرپٹ حکمرانوں کو اللوں تللوں کا موقع دے اور مسلمان عوام کو بھوکا مارے تاکہ مسلمان دبے رہیں، غربت میں پستے رہیں، مغربی آقاؤں کے آگے سر نہ اٹھا سکیں، ان کے غلام بنے رہیں اور مغربی فکر و تہذیب کے اصول و اقدار کو اپنانے سے انکار نہ کرسکیں۔۔۔مطلب یہ کہ فوری تکالیف اور ظاہری علامتوں سے جو مرض نظر آتا ہے وہ بالعموم اتنا سادہ نہیں ہوتا اور نہ اتنی سادگی سے اس کا علاج ممکن ہوتا ہے جب تک اس کی جڑ تک نہ پہنچا جائے اور اسے بنیاد سے ٹھیک نہ کیا جائے۔

ہمارے اس اسلوب فکر کے دو نتیجے نکل سکتے ہیں جو ہمارے قاری کو پہلے سے ذہن میں رکھنے چاہئیں۔ ایک تو یہ کہ تحریر سادہ اور عام فہم ہونے کی بجائے کچھ دقیق ہوجائے اور دوسرے یہ محسوس ہو کہ بات موضوع سے ہٹ گئی ہے یا غیر متعلق ہوگئی ہے مثلاً اگر کسی آدمی کو سر درد ہو اور ڈاکٹر اس کے معدے کا علاج شروع کردے تو ممکن ہے یہ بات مریض اور اس کے لواحقین کو غیر متعلق لگے اور اس کا فوری نتیجہ بھی برآمد نہ ہو لیکن اگر معائنے اور ٹیسٹوں کے بعد ڈاکٹر اس واضح نتیجے پر پہنچے کہ سر درد کی اصل وجہ معدے کی خرابی ہے تو مریض کے دیرپا علاج کے لیے ڈاکٹر کو معدے کا ہی علاج کرنا چاہیے۔ ایک اور بات یہ کہ موضوع اتنا اہم اور وسیع ہے کہ اس پر تفصیل سے لکھا جانا چاہیے لیکن ہمارے پیش نظر چونکہ البرہان کے لیے ایک مضمون لکھنا ہے نہ کہ پوری کتاب لکھنا اس لیے ہم اختصار کو ملحوظ خاطر رکھیں گے اور کوشش کریں گے کہ یہ اختصار فہم مطالب میں مخل نہ ہو۔

کیا پاکستانی معاشرہ بحران کا شکار ہے؟

ہماری رائے میں پاکستانی معاشرہ بحران کا شکار ہے۔ بحران ہم اس کو کہتے ہیں جب بگاڑ بڑھ جائے، مشکلات اور مسائل حل نہ ہوں، اصلاح کی ذمہ دار قوتیں غیر مؤثر اور ناکام ہوجائیں، معاشرہ اضطراب و ہیجان کا شکار ہوجائے اور معاشرے و ریاست کی ٹوٹ پھوٹ اور اچانک و غیر منظم تبدیلی کا امکان بڑھ جائے۔ بحران کی اس تعریف کے مطابق پاکستانی معاشرہ اس وقت سچ مچ بحران کا شکار ہے اور اس کی اصلاح کے لیے صحیح اور مؤثر اقدامات کی فوری ضرورت ہے اور خوش فہمی میں مبتلا ہوکر یا لاپروائی سے اس بحران کو اہمیت نہ دینا اور اس سے نمٹنے کی کوشش نہ کرنا نادانی ہوگی۔

بحران کے اسباب

اگرچہ اس بحران کے اسباب کئی ایک ہیں ـــ بلکہ ان کی ایک پوری فہرست گنوائی جاسکتی ہے[1] لیکن بنیادی، فکری اور اصولی اسباب، جن کی حیثیت ام الامراض کی سی ہے، دو ہیں:

۱۔ اپنے نظریۂ حیات سے عدم وابستگی اور اس کی تعلیمات اور تقاضوں پر عمل نہ کرنا

۲۔ مغربی فکر و تہذیب کی پیروی

یہ دونوں اصول اگرچہ قرآن و سنت سے مستنبط ہیں اور اس کے لیے تفصیلی حوالے دیے جاسکتے ہیں (تفصیل کے لیے دیکھیے ہماری دو کتابیں 'مسلم نشأۃ ثانیہ' اور 'اسلام اور تہذیب مغرب کی کشمکش') لیکن یہ دونوں اصول معروضی، عالمی، منطقی اور عقلی بھی ہیں کیونکہ کوئی بھی قوم جو اپنے نظریۂ حیات سے وابستگی ترک کردے اور ایسے افکار، اصول، اقدار پر عمل شروع کردے جو اس کے نظریۂ حیات کی نقیض ہوں تو اس کی پستی اور زوال ناگزیر ہوجاتا ہے کیونکہ انسانوں میں وہ بنیادی خصائص جو دنیا میں ترقی اور سربلندی کے لیے ضروری ہیں (مثلاً محنت، تنظیم، پابندیٔ قانون، اطاعت امیر، ایثار وغیرہ)، پیدا ہی اس وقت ہوتے ہیں جب فرد کسی نظریۂ حیات سے مستحکم وابستگی اختیار کرے اور اگر کوئی فرد یا معاشرہ دو ایسی کشتیوں پر پیر رکھے ہوئے ہو جو ایک دوسرے کی مخالف سمت جارہی ہوں تو اس کا ڈوب جانا ظاہر سی بات ہے۔ لہٰذا پاکستانی معاشرے کے بحران کا نقلی و عقلی سبب یہ ہے کہ یہاں معاشرہ عملاً نظریاتی طور پر یکسو نہیں رہا، اس کا دعوی اسلام ہی پر عمل کا ہے لیکن عملاً وہ مغرب کی ملحدانہ فکر و تہذیب سے مرعوب و متاثر ہوکر اس کی پیروی کر رہا ہے۔

سطور بالا میں ہمارے استدلال کا انحصار اس بات پر ہے کہ مغربی فکر وتہذیب اسلامی تعلیمات کی نقیض ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں مغربی فکر وتہذیب کے براہ راست مطالعے کی روایت کمزور ہے ورنہ جن اصحاب نے بھی مغربی تہذیب کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ مغربی تہذیب جن فکری بنیادوں پر کھڑی ہے وہ اسلام کی عین ضد ہیں مثلاً ہیومنزم (Humanism) کا تصور یہ ہے کہ آدمی دنیا میں خود مختار بلکہ مختار مطلق ہے اور کسی ہستی کا عبد نہیں ہے۔ سیکولرزم یہ ہے کہ اگر کسی نے خدا و رسول کو ماننا ہے تو اپنی ذاتی زندگی میں مان لے لیکن خدا و رسول کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ ہماری اجتماعی زندگی میں دخل دیں یعنی انسان خود یہ طے کرتا ہے کہ اللہ کا دائرہ کار کیا ہونا چاہیے اور کہاں اس کی بات مانی جائے اور کہاں نہ مانی جائے۔ کیپٹل ازم کا حاصل یہ ہے کہ دنیا کی زندگی اور خوشحالی ہی ہماری ساری جدوجہد اور سرگرمیوں کا مرکز ہونی چاہیے نہ کہ آخرت۔ اسی طرح ایمپر یسزم (Empericism) کا مطلب یہ ہے کہ 'علم' اور 'حق' صرف وہ ہے جس کا مشاہدہ اور تجربہ کیا جا سکے گویا وحی کا انکار اور عدم اہمیت۔

خلاصہ یہ کہ مغربی فکر وتہذیب کا عقیدہ یا ورلڈ ویو یہ ہے کہ اللہ حاکم مطلق نہیں ہے اور انسان اس کا عبد نہیں ہے بلکہ انسان خود مختار اور مختار مطلق ہے کہ زندگی جیسے چاہے بسر کرے اور اصل اہمیت اس دنیا کی ہے لہٰذا دنیا کی زندگی میں مگن رہو، آخرت کو بھول جاؤ۔ قرآن و حدیث کچھ نہیں اصل چیز عقل اور سائنس ہے۔ گویا مغربی تہذیب کے ورلڈ ویو کا حاصل ہے خدا، رسول، آخرت اور قرآن کی نفی۔ اب بتائیے کہ یہ بے دینی ہے یا نہیں اور یہ نظریات اسلام کے نقیض ہیں یا نہیں؟

اس پر مستزاد اہل مغرب کی اسلام اور مسلم دشمنی ہے بلکہ وہاں قوت حاصل کرنے کا جذبۂ محرکہ ہی اسلام اور مسلم دشمنی تھی جب ۱۴۵۳ء میں سلطان محمد فاتح نے قسطنطنیہ پر فتح حاصل کر لی اور عیسائیت کا ہیڈ کوارٹر وہاں مغلوب ہوگیا تو عیسائی پادری وہاں سے نکل کر یورپ بھر میں پھیل گئے اور مسلمانوں کے خلاف نفرت اور انتقام کے جذبات ابھارنے لگے چنانچہ یورپ میں پیداری پیدا ہوئی، انہوں نے قوت حاصل کی، مسلم ممالک پر یلغار کی، انہیں روندا، کچلا، غلام بنایا اور ان کی صدیوں سے جمع کردہ دولت اور مادی وسائل کو لوٹا اور اپنے ہاں لے گئے۔ پھر مسلمانوں کو ہمیشہ کے لیے غلام رکھنے کی خاطر ان کا سیاسی، تعلیمی، معاشی، معاشرتی اور قانونی ڈھانچہ توڑ کر اسے اپنی فکر و تہذیب کے مطابق از سر نو استوار کیا اور مسلمانوں میں ایسے افراد اور طبقات پیدا کرنے میں کامیاب

ہو گئے جو ان کی تہذیب کے رسیا تھے اور اسے ہی ترقی اور سربلندی کا زینہ اور معراج سمجھتے تھے۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے بعد جب یورپ کمزور ہوا اور مسلمانوں کی جدوجہد آزادی بھی جاری تھی تو انہیں مجبوراً مسلم ممالک کو آزادی دینا پڑی۔ اب استعمار نے چولا بدل لیا۔ اس نے اپنے تیار کردہ مغرب پرست عناصر کو نو آزاد شدہ ممالک میں اقتدار دلوایا اور پُرامن ذرائع سے تعلیم، میڈیا، مالی امداد، فیملی پلاننگ اور جمہوریت وغیرہ کے نام پر مسلم ممالک میں نفوذ کر کے اپنے مقاصد حاصل کرنے کی کوشش کی اور جب اس کے باوجود کچھ مسلم ممالک نے سر اٹھا کر جینے کی استعداد حاصل کر لی اور اسلام کی طرف رجوع کرنا شروع کر دیا تو امریکہ و یورپ نے اپنی مجموعی حربی و مادی قوت سے پہلے عراق کو تباہ و برباد کیا، پھر افغانستان کا تورا بورا بنایا اور اب پاکستان اور لیبیا پر حملے جاری ہیں۔

عملی سبب

مذکورہ بالا نظری اسباب کے ساتھ عملی پہلو سے دیکھا جائے تو پاکستانی معاشرے میں جس طرح بگاڑ اور فساد بڑھ رہا ہے وہ اس امر کا مظہر ہے کہ یہاں اصلاحی قوتیں کمزور اور غیر مؤثر ہو چکی ہیں اور ان کی حکمت عملی اور لائحہ عمل زیادہ کامیاب نہیں رہا اور بگاڑ و فساد پیدا کرنے والی ابلیسی قوتیں یہاں مقابلتاً طاقتور اور کامیاب ہیں۔ اصلاحی قوتوں کی ناکامی کے اسباب داخلی بھی ہیں اور خارجی بھی۔ داخلی اسباب میں اخلاص و فراست کی کمی، فرقہ واریت، انتشار و عدم اتحاد وغیرہ اور خارجی اسباب میں اسلام دشمن مغربی طاقتوں اور ان کے مقامی ایجنٹوں کی سازشیں شامل ہیں جو کسی قیمت پر اسلامی عناصر کو کامیاب نہیں ہونے دینا چاہتے۔

بحران کا حل

جب ہم نے بیماری کے اسباب و وجوہات کا پتہ چلا لیا تو اب اس کا علاج ممکن و سہل ہے اور علاج بھی پائیدار ہونا چاہیے تاکہ بیماری جڑ سے جائے لیکن بعض لوگ عارضی اور وقتی علاج کی طرف لپکتے ہیں جو درحقیقت علاج نہیں ہوتا محض عارضی طور پر مرض کی علامتیں کچھ کم ہوتی ہیں یا بدل جاتی ہیں مثلاً سیاسی حکومت کمزور ہو تو فوج اقتدار پر قبضہ کر لیتی ہے اور اسے 'فوجی انقلاب' کا نام دے دیا جاتا ہے حالانکہ اس سے محض چہرے بدلتے ہیں نظام نہیں بدلتا۔ اہل پاکستان کو اس طرح کے 'انقلابوں' کا اور ان کے نتائج کا خوب تجربہ ہے یہی وجہ ہے کہ اب وہ اس طرح کے کسی 'انقلاب' کے

حق میں نہیں۔ ان دنوں عالم عرب میں فوجی آمروں کے خلاف عوام اٹھ کھڑے ہوئے ہیں لیکن حسبِ معمول وہاں امریکہ ومغرب کی مداخلت اور سازشیں عروج پر ہیں اور ان کی پوری کوشش ہے کہ کوئی حقیقی اور نظریاتی تبدیلی ان ممالک میں نہ آئے اور صرف چہرے بدل جائیں اور نئے آنے والے بھی ان کی مرضی اور ڈھب کے آدمی ہوں۔

بہرحال بات ہورہی تھی جسد ملت کو لاحق بیماریوں کے پائیدار علاج کی۔ ہماری رائے میں پائیدار علاج ہے۔۔۔لا الہ الا اللہ۔۔۔مطلب یہ کہ ایک حقیقی خدا کا اثبات کیجیے اور سارے غیر حقیقی خداؤں کا انکار کر دیجیے۔ دوسرے لفظوں میں اسلام پر یکسو ہوجایئے اور اس کے تقاضوں کو پورا کیجیے اور غیر اسلام بالخصوص مغربی فکر وتہذیب کو ترک کر دیجیے۔

لیکن یہ تو ایک اصولی بات ہے، سوال یہ ہے کہ پاکستانی معاشرے کے بحران کے حل کے لیے عملاً کیا کیا جائے یا کیا کیا جا سکتا ہے؟☆ ہماری رائے میں مطلوبہ حکمت عملی دو نکات پر مبنی ہونی چاہیے: ایک تو یہ کہ موجودہ اصلاحی قوتیں اپنی حکمت عملی پر نظر ثانی کریں اور اپنے کام کو مؤثر اور نتیجہ خیز بنانے کے لیے اقدامات کریں۔

دوسرے یہ کہ ایک نئی اصلاحی قوت کھڑی کی جائے جو موجودہ آزمائے ہوئے اصلاحی مناہج کی بجائے اصلاح وتعمیر کا ایک نیا منہج اپنائے اور کام کے نئے رستے نکالے تاکہ جن جہات میں کام نہیں ہورہا وہاں کام کیا جائے اور جس اسلوب سے نہیں ہورہا اس اسلوب سے کیا جائے۔ اس سے لامحالہ موجودہ اصلاحی قوتوں کو تقویت ملے گی اور شریعت پر عمل پیرا ہونے کی منزل قریب آئے گی۔

گویا اب ہمارے سامنے کام یہ ہے کہ پہلے موجودہ اصلاحی قوتوں کے کام کا تجزیہ کرتے ہوئے انہیں کچھ مشورے دیے جائیں تاکہ ان کا کام مؤثر اور نتیجہ خیز ہوسکے اور دوسرے اُس نئے منہج کی نشان دہی کی جائے جس پر عمل کرکے وہ اہم کام کیے جاسکتے ہیں جو موجودہ مناہج میں نہیں ہو پارہے

موجودہ اصلاحی مناہج

☆ جب ہم بات فرد اور معاشرے کے اسلامی مستقبل کے حوالے سے کررہے ہیں تو ظاہر ہے کہ حکومتی ڈھانچہ اور سول سوسائٹی کے وہ عناصر جو مختلف عوامل بالخصوص مغربی فکر وتہذیب کے زیر اثر فرد اور معاشرے کو اسلام سے دور لے جارہے ہیں انہیں ہم یہاں زیر بحث ہی نہیں لائے کیونکہ اسلامی تناظر میں ان کا کوئی مثبت کردار نہیں (اسلامی عناصر اور عوام کے دباؤ پر کچھ اسلامی اقدامات کرلینا الگ بات ہے) بلکہ وہ تو الٹا بگاڑ وفساد کا سبب بن رہے ہیں، مسائل پیدا کررہے ہیں اور انہیں بڑھا اور پیچیدہ بنا رہے ہیں۔

اگر چہ اسلام میں دین و دنیا میں کوئی تفریق نہیں بلکہ شریعت نازل ہی لوگوں کے دنیوی امور کی تنظیم کے لیے ہوئی ہے یا بالفاظ دیگر شریعت نام ہے ان تعلیمات، ضوابط اور قوانین کا جو انسان کی دینوی زندگی کو منظم کرتے ہیں۔ تاہم تفہیم کی خاطر ہم دین کو چار بڑے شعبوں عقائد، عبادات، اخلاق اور معاملات میں تقسیم کر سکتے ہیں اور اسی طرح دنیوی زندگی کو سیاست، معیشت، معاشرت، تعلیم،

قانون وغیرہ میں تقسیم کیا جا سکتا ہے اور سارے دین کو مانتے ہوئے ایک شخص یا ایک جماعت دین و دنیا کے کسی ایک شعبے میں کام کرسکتی ہے جیسے سیاسی، تبلیغی، معاشی وغیرہ۔ ہم یہاں دو بڑے شعبوں کی عملی کاوشوں کا ذکر کریں گے: ایک سیاسی اور دوسرے تبلیغی۔

دینی سیاسی جماعتیں

دینی سیاسی جماعتیں اگر مندرجہ ذیل حقائق سامنے رکھیں تو انہیں اپنی جدوجہد کو مؤثر اور نتیجہ خیز بنانے اور اس غرض سے اپنے لائحہ ہائے عمل پر نظر ثانی کرنے میں آسانی رہے گی:

۱۔ ساری دنیا (امریکہ، یورپ، چین، روس، آسٹریلیا وغیرہ) ان کے خلاف متحد ہے اور نہیں چاہتی کہ پاکستان میں اسلامی عناصر اقتدار میں آئیں۔

۲۔ ان کا فرقہ واریت (یعنی فقہی و کلامی مسالک) کی بنیاد پر دینی جماعتیں بنانا (جب کہ یہ آئین پاکستان کی رو سے بھی غلط ہے اور عقل عام کے بھی خلاف ہے کیونکہ اس سے فرقہ واریت بڑھتی ہے اور امت تقسیم ہوتی ہے۔ پھر یہ کہ ایک مسلک دوسرے مسلک کو ووٹ نہیں دے گا لہٰذا مسلک کی بنیاد پر بننے والی جماعت قیامت تک برسر اقتدار نہیں آسکتی) اور پھر ہر جماعت کا دھڑوں میں تقسیم ہونا کوئی اتفاقی حادثہ نہیں بلکہ مغربی ممالک کی ایجنسیوں اور ان کی ایجنٹ مقامی حکومت اور اس کی ایجنسیوں کی باقاعدہ پلاننگ کا نتیجہ ہے۔ لہٰذا اگر وہ اخلاص اور فراست رکھتی ہیں تو انہیں اس صورت حال کا ادراک کرنا چاہیے اور اسلامی اہداف کی خاطر متحد ہو جانا چاہیے۔

۳۔ انہیں اس پر غور کرنا چاہیے کہ مغربی جمہوریت کو بعض کاغذی نظری تبدیلیوں کے بعد مشرف با اسلام کرنے اور اس میں حصہ لے کر اس کی مزید اصلاح کرنے اور اس کے ذریعے معاشرے میں دین نافذ کرنے کا ان کا منصوبہ پچھلے ۶۳ سال کی جدوجہد کے باوجود کامیاب نہیں ہوا۔ الٹا اس کے نتیجے میں سیاست اور دیگر سارے شعبہ ہائے زندگی میں مغربیت اور سیکولرزم غالب آ گیا ہے۔

۴۔ اس وقت سب سے بڑا مسئلہ پاکستان کی قومی خودمختاری کا ہے کیونکہ ہم عملاً امریکہ کے غلام بن کر رہ گئے ہیں اور ہماری بدقسمتی اور دشمن کی کامیاب پلاننگ کہ ہماری سیاسی جماعتوں (بڑی سیاسی جماعتوں جیسے پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ ن اور چھوٹی سیاسی جماعتوں جیسے اے این پی اور متحدہ) کے علاوہ فوج، عدلیہ، میڈیا اور بیوروکریسی نے بھی اس امریکی بالادستی کو قبول کرلیا ہوا ہے۔ اس صورت حال میں پاکستان میں جمہوریت اور نفاذ اسلام کا دعویٰ اور کوششیں بے معنی ہوکر رہ گئی ہیں۔ دینی جماعتوں میں جماعت اسلامی اور سیاسی جماعتوں میں عمران خان کی تحریک انصاف کے سوا کوئی امریکہ کے خلاف آواز اٹھانے تک تیار نہیں۔ عمران خان کا سیکولر ہونا واضح ہے لہٰذا جماعت اسلامی کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ امریکی غلامی سے نجات کے لیے قوم کو اکٹھا کرے اور تحریک چلائے۔ اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ جماعت محض اپنی جماعتی اور تنظیمی قوت پر انحصار نہ کرے اور نہ لوگوں کے لیے جماعتی قیادت میں کام کرنے کی شرط رکھے بلکہ اسے آگے بڑھ کر ہر اس جماعت، ادارے، تنظیم، تحریک اور سول سوسائٹی کے ہر طبقے کو اس ایک نکتے پر جمع اور متحرک و منظم کرنا چاہیے اور انہیں تحریک کی قیادت میں شامل کرنا چاہیے۔

۵۔ دینی سیاسی جماعتوں کے قیام کی شرعی اساس امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور اصلاح ہے لہٰذا ان کا اہم ترین ہدف یہ ہونا چاہیے کہ عوام خود بھی احکام شریعت پر عمل کریں اور حکومت بھی شریعت کے احکام پر عمل کرائے اور اس کے لیے محض قانون سازی کافی نہیں بلکہ عوام کی تعلیم و تربیت کی بھی ضرورت ہے تاکہ وہ صدق دل سے ان قوانین پر عمل پر آمادہ ہو جائیں اور ایسے لوگوں کو ووٹ دے کر حکمران بنائیں جو نفاذ شریعت کے لیے پُرجوش ہوں۔

تبلیغی جماعتیں

۱۔ بدقسمتی سے ہمارے معاشرے میں دعوت و تبلیغ کا کام بھی مسلک پرستی پر مبنی ہے جیسے دیوبندی حضرات کی تبلیغی جماعت اور بریلوی بھائیوں کی دعوت اسلامی ۔۔۔وغیرہ۔ ہمارے علماء کرام مغربی اور پاکستانی خفیہ ایجنسیوں کی چالوں کو نہ سمجھتے ہوئے سیاسی اور تبلیغی جماعتیں، مدرسے، مسجدیں اور دینی تعلیم کے وفاق تو پہلے ہی مسلکی بنیادوں پر بنائے ہوئے تھے اور اب ہر دینی مسلک نے اپنا ٹی وی چینل کھول کر فرقہ واریت کو مزید ہوا دینے کا انتظام کرلیا ہے۔ کاش یہ لوگ مسلک کو دین نہ بناتے۔ ان کے مسلک پر ظاہر ہے کسی کو اعتراض نہیں لیکن مسلک کو دعوت و تحزب کی بنیاد بنانا دین کی

حقیقی سپرٹ کے خلاف ہے۔

۲۔ ان دینی جماعتوں کے سامنے سب سے بڑا چیلنج یہ ہے کہ وہ اپنی تبلیغ و دعوت کو کلمے اور نماز روزے تک محدود نہ رکھیں بلکہ پورے دین کی دعوت دیں۔ بلاشبہ تعلق باللہ اور عبادات بہت اہم اور بنیادی اہمیت کی حامل ہیں لیکن ہم یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ شریعت تو نام ہی دنیوی تنظیم وفلاح کا ہے لہٰذا دین اور شریعت کا کوئی ایسا تصور کیسے صحیح ہوسکتا ہے جو ہماری دنیا کو نہ سنوارے اور اس پر اثر انداز نہ ہو۔ پس ان دینی وتبلیغی جماعتوں کو اصرار کے ساتھ پورے دین کی تبلیغ کرنی چاہیے تا کہ عامۃ الناس کی ہمہ گیر اصلاح ہو جو زندگی کے سارے شعبوں کو محیط ہو تا کہ ایک مسلمان کو دنیا اور آخرت دونوں میں فلاح وکامرانی نصیب ہو۔

اوراسی میں شامل سمجھنا چاہیے اس تعلیمی کام کو جو ہمارے معاشرے میں دینی مدارس سرانجام دے رہے ہیں۔ بدقسمتی سے یہ کام بھی ناقص ہے اور پورے دین کی نمائندگی نہیں کرتا بلکہ اس نے بھی دنیا کو دین کے دائرے سے باہر کی چیز سمجھ رکھا ہے حالانکہ قرآن وسنت اور فقہ کی کوئی ایسی تعبیر کیسے صحیح ہوسکتی ہے جو ہماری دنیا کو زیر بحث نہ لائے اور اس پر اثر انداز نہ ہو۔ اس کو انتظامی مسئلہ کہہ کر بھی جان نہیں چھڑائی جاسکتی کیونکہ مدارس کے باہر جو عصری تعلیم دی جارہی ہے وہ بھی اسلامی تعلیمات اور تقاضوں کے مطابق نہیں لیکن دینی مدارس اور علماء کرام اُس تعلیم کو اسلام کے مطابق بنانے کے لیے کوئی کوشش نہیں کررہے۔

پاکستان میں احکام شریعت پر عمل کے لیے نئے منہج کی ضرورت

جیسا کہ ہم نے سطور بالا میں عرض کیا کہ پاکستان میں بعض دینی سیاسی جماعتیں نفاذ شریعت کے لیے سیاسی جدوجہد کررہی ہیں لیکن اس میں انہیں بوجوہ زیادہ کامیابی نہیں ہوسکی (اور ان وجوہ و اسباب کی طرف بھی ہم نے اشارہ کردیا ہے) اور دینی مدارس اور کچھ دعوتی وتبلیغی جماعتیں جو کام کر رہی ہیں وہ بھی آج کی اصطلاح میں 'مذہبی آدمی' تو پیدا کررہی ہیں (جو مثلاً داڑھی رکھتا، نماز پڑھتا اور شلوار قمیض پہنتا ہے) لیکن پورا دینی آدمی پیدا نہیں کررہیں جس کی دنیا بھی دین کے مطابق ہو۔ اس سیاسی ناکامی اور جزوی دعوتی کام سے ایک خلاء پیدا ہوا ہے جسے مغربی تہذیب نے پورا کیا ہے اور پاکستانی معاشرہ بڑی تیزی سے مغربی فکر وتہذیب کو اپنا رہا ہے جب کہ مذکورہ دینی عناصر اپنے منہج میں کوئی تبدیلی قبول کرتے نظر نہیں آتے۔ ان حالات میں ہم سوچتے ہیں کہ پاکستان میں ایک نئے منہج

سے احکام شریعت پر عمل کرنے کی ضرورت ہے جو موجودہ دینی کاموں کے خلاء کو پُر کر سکے اور موجودہ اصلاحی کاموں کو کمک پہنچائے۔ ہم اسے سیاسی اور تبلیغی کی بجائے 'سماجی تبدیلی' کا منہج کہنا چاہیں گے۔
نئے منہج کی اساس دو نکات ہوں گے:

۱۔ 'متوازن' تعلیم وتربیت کے ذریعے 'متوازن فکر وعمل' کے حامل 'فرد' کی تیاری

۲۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی میں شریعت پر عمل کے خواہاں افراد کو منظم ومتحرک کر کے زندگی کے اہم شعبوں میں ادارے بنا کر احکام شریعت پر عمل درآمد اور معاشرے کے مسائل کا حل جن کی اجازت ریاست کا آئین دیتا ہے جیسے تعلیم ، میڈیا، عدل وانصاف، امن وامان، اصلاح اخلاق وغیرہ۔

ان دو نکات کی تفصیل، جواز اور حکمت یہ ہے:

۱۔متوازن فرد کی تیاری کی اہمیت

دنیا میں آج تک جتنے بھی بڑے انقلاب آئے ہیں اور جتنی بھی تہذیبیں پروان چڑھی ہیں، اگر ان کا مطالعہ کیا جائے تو یہی بات سامنے آتی ہے کہ اجتماعی تبدیلی اور ترقی کی اساس فرد ہے۔ گویا اصل کام انسان سازی ہے۔ یہی بات قرآن حکیم میں بار بار اس اسلوب میں کہی گئی ہے کہ اللہ نے جتنے بھی پیغمبر بھیجے اس لیے بھیجے کہ وہ تعلیم کتاب وحکمت کے ذریعے افراد کے نفوس کا تزکیہ کریں تا کہ ایسے افراد تیار ہو جائیں جو برضا ورغبت اللہ و رسول کی تعلیمات کے مطابق زندگی گزارنے پر آمادہ ہوں۔ یہی افراد اسلامی معاشرے کی تشکیل کرتے ہیں۔ چنانچہ دیکھیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو عظیم الشان انقلاب لائے وہ ان صحابہ کرام کے ہاتھوں ہی آیا جن کی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تربیت کی تھی۔ آج بھی ہمارے معاشرے میں جو خرابیاں ہیں انہیں دور کرنے اور مسلم امت کی عظمت گم گشتہ بحال کرنے کا نسخہ یہی ہے کہ انسان سازی کا کام کیا جائے اور صحیح تعلیم وتربیت کے ذریعے ایسے افراد تیار کیے جائیں جو قرآن اور اسلام کا انسان مطلوب ہوں۔

انسان سازی یا انسانوں کی تعمیر سیرت و کردار میں بنیادی کردار تعلیمی ادارے ادا کرتے ہیں (اگرچہ اس میں گھر، والدین، دعوتی تحریکوں اور میڈیا کا کردار بھی اہم ہوتا ہے) لیکن پاکستان میں مغرب پرستانہ حکومتی پالیسیوں اور میڈیا نے تعلیم میں الٹا بگاڑ پیدا کیا ہے اور دینی سیاسی جماعتیں اپنی سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے اور تبلیغی تحریکیں اور دینی مدارس اپنے مخصوص منہج کی وجہ سے عام تعلیم کے ذریعے مسلم شخصیت کی متوازن تعمیر میں زیادہ فعال کردار ادا نہیں کر سکے اس لیے مجوزہ تحریک صحیح اور

متوازن تعلیم و تربیت کے ذریعے فرد کی تعمیر سیرت و کردار پر بھرپور توجہ دے گی۔ اس غرض سے عصری و دینی تعلیم کے موجودہ مناہج میں دوررس تبدیلیاں لانا پڑیں گی جن کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

۲۔شریعت پر عمل اور مسائل کے حل کے لیے پرائیویٹ سیکٹر میں منظم جدوجہد کی ضرورت

اس میں شک نہیں کہ شریعت کا نفاذ اور معاشرے کے مسائل حل کرنا حکومت کا کام ہے کہ اس کے پاس اختیار و اقتدار ہوتا ہے اور افرادی و مادی وسائل ہوتے ہیں لیکن اکثر مسلمان ممالک میں حکومتیں چونکہ ایسے طبقات و افراد کے ہاتھوں میں ہیں جو مغرب تہذیب کے تربیت یافتہ ہیں، اس سے مرعوب و متاثر ہیں، اس کی پیروی ہی کو ترقی کا زینہ سمجھتے ہیں اور مغربی قوتوں کی مدد ہی سے اقتدار میں آتے ہیں اور اپنے اقتدار کو طول دینے اور مستحکم رکھنے کے لیے مغربی ممالک کی کاسی لیسی کرنے بلکہ ان کے ایجنٹ کا کردار ادا کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں اور ان کی پالیسیوں کو اپنے ملک میں نافذ کرنے کے لیے کوشاں رہتے ہیں خواہ ان سے اپنے دین اور اپنے ملک کا نقصان ہی ہو اور عوام کو ان کی پالیسیوں سے دکھ اور تکلیف ہی پہنچ رہا ہو اور ان کی مشکلات و مسائل میں اضافہ ہی ہو رہا ہو اور قوم ترقی و عروج کی طرف بڑھنے کی بجائے زوال و ادبار کے گڑھوں میں ہی گر رہی ہو۔ اس طرح کے حکمران اپنے مغربی آقاؤں کو خوش کرنے کے لیے ایسی پالیسیاں بنانے میں بھی دریغ نہیں کرتے جو غیر اسلامی ہوں، مسلم عوام کو دین سے دور لے جانے والی ہوں اور ملحدانہ مغربی اصول و اقدار کو معاشرے میں پروموٹ کرتی ہوں۔

بعض دینی سیاسی جماعتوں کا ایسے مغرب پرست سیاسی و عسکری حکمرانوں کی مخالفت کرنا، ان کی اصلاح کی کوشش کرنا اور دباؤ ڈال کر ان سے عوام کے مسائل حل کرانے کی کوشش کرنا بلاشبہ قابل تحسین ہے اور اس طرح کے حکمرانوں نے مغربی فکر پر مبنی جو سیاسی نظام ملک میں رائج کر رکھا ہے، اس میں حصہ لے کر برسر اقتدار آنے کی کوشش کرنا تاکہ وہ اسلامی تناظر میں عوام کے مسائل حل کرسکیں، احسن ہے لیکن مغربی طاقتیں اپنے ایجنٹ مسلم حکمرانوں سے مل کر ہمیشہ کوشش کرتی ہیں کہ ایسے دینی عناصر کو بہر قیمت ناکام بنا دیا جائے اور اسلام پسند عوام کی حقیقی رائے عامہ ریاستی سطح پر مؤثر نہ ہوسکے۔ ان حالات میں سیاسی دینی جماعتیں عوامی مشکلات و مسائل کے حل اور عوام کی دینی تعلیم و تربیت میں زیادہ کردار ادا نہیں کرسکتیں۔ جہاں تک غیر سیاسی دعوتی و تبلیغی تحریکوں کا تعلق ہے تو

نفاذ شریعت کی عملی جدو جہد اور عوام کے مسائل کا حل ان کے اہداف میں شامل ہی نہیں ہے۔

اس وقت تک ہم نے جو عمومی گفتگو کی ہے اسے ہم پاکستان کے عملی تناظر میں دیکھیں تو صاف نظر آتا ہے کہ پاکستان میں بڑی سیاسی جماعتیں، فوج (جس کا کردار ملکی معاملات میں اہم ہے اور وہ بہت عرصہ برسر اقتدار بھی رہی ہے) بیوروکریسی اور میڈیا مغربی قوتوں کے دباؤ میں ہیں، سیکولر ہیں اور اسلامی تعلیمات و اقدار کے نفاذ کی حامی نہیں ہیں (مجبوری اور منافقت سے بطور ڈپلومیسی اسلام کا نام لینا الگ بات ہے) اور نتیجتاً سمت غلط ہونے کی وجہ سے عوامی مشکلات و مسائل میں اضافے کا سبب بنی ہوئی ہیں۔ دینی سیاسی جماعتوں کو فرقوں میں بانٹ کر انہیں متحد اور کامیاب ہونے دینے کا اسٹیبلشمنٹ اور خفیہ ایجنسیوں [مقامی و مغربی دونوں] نے باقاعدہ انتظام کر رکھا ہے اور وہ سیاست میں اتنی گھری اور کھبی ہوئی ہیں کہ عوام کی دینی تعلیم وتربیت اور ان کے مسائل کے حل کے لیے وہ کوئی عملی اقدامات کرنے کی پوزیشن میں نہیں۔تبلیغی تحریکوں کا وژن محدود ہے اور دین کے دینوی کردار اور ملحدانہ مغربی فکر وتہذیب کی اسلام اور مسلم دشمن پالیسیوں، پلاننگ اور سازشوں سے وہ لاتعلق نظر آتی ہیں۔

پس چہ باید کرد

ہماری رائے یہ ہے کہ دینی سیاسی جماعتوں اور تبلیغی تحریکوں سے باہر بھی علماء کرام، اسلامی سکالرز اور سول سوسائٹی کے مختلف طبقات میں دین پسند عناصر کا ایک خاصا بڑا حلقہ موجود ہے لیکن کوئی متبادل سمت اور لائحہ عمل نہ ہونے کی وجہ سے وہ بھی غیر منظم، غیر فعال اور غیر مؤثر ہے۔ ہماری تجویز یہ ہے کہ اس طبقہ کو منظم و متحد کیا جائے اور وہ سیاست میں الجھے بغیر سماجی سطح پر اسلامی تعلیمات پر عمل اور عوام کی مشکلات کے حل کے لیے کام کرے۔

ہمارے نزدیک اس مجوزہ حلقے یا تحریک کے لیے زندگی کے مختلف شعبوں میں احکام شریعت پر عمل کے لیے منظم کام کی وسیع گنجائش موجود ہے اور مغربی جمہوریت کے بنیادی اصول اگرچہ غیر اسلامی ہیں لیکن بطور سیاسی نظام اس میں یہ خوبی بہرحال موجود ہے کہ اس میں دم گھٹنے والا جبر اور آمریت نہیں ہوتی اور خصوصاً اگر کوئی مقتدر طبقات کا براہ راست سیاسی حریف بھی نہ ہو تو پھر اس کے لیے کام کی خاصی گنجائش نکل آتی ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ نئی مجوزہ تحریک اسی خلاء یا گنجائش سے

فائدہ اٹھائے اور منظم انداز میں کام کرے۔ اس کام میں اسے حکومت اور سیاسی و دینی جماعتوں سے الجھنے کی بھی ضرورت نہیں بلکہ جہاں تک ہو سکے ان کا تعاون حاصل کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں سمجھنا

تحریک اصلاح تعلیم جن دو مقاصد کے لیے کام کر رہی ہے ان میں سے ایک موجودہ تعلیمی نظام کی اسلامی تناظر میں اصلاح اور دوسرے ایک نئے رول ماڈل تعلیمی ادارے (سکول تا یونیورسٹی) کا قیام ہے۔ پہلے مقصد کے لیے تحریک نے اصلاح نصاب، تربیت اساتذہ، تعلیمی اداروں کے ماحول کی بہتری اور طلبہ کی اسلامی تربیت کے حوالے سے لٹریچر بھی تیار کیا ہے اور مقدور بھر عملی جدوجہد بھی کر رہی ہے۔ تاہم افرادی اور مادی وسائل کی کمی کی وجہ سے یہ کام اتنے بڑے پیمانے پر نہیں ہو سکا کہ ملکی سطح پر اس کے اثرات سامنے آتے۔

دوسرے مقصد کے لیے بھی تحریک نے ہوم ورک کیا ہے، لٹریچر تیار کیا ہے اور تعلیمی ثنویت کے بُرے اثرات کم کرنے کے لیے لاہور میں ایک ادارہ (صفاء انسٹی ٹیوٹ) قائم کیا ہے جو دینی مدارس کے طلبہ و اساتذہ کے لیے معاصر علوم اور جدید تعلیمی اداروں کے فارغ التحصیل حضرات کے لیے دینی تعلیم کے مختلف پروگرام منعقد کرتا رہتا ہے۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ جو لوگ تحریک کی اس فکر سے متفق ہوں وہ نئے رول ماڈل تعلیمی اداروں کے قیام کے بارے میں سوچیں اور اس پر عمل کریں۔ ایک نئے رول ماڈل تعلیمی ادارے کے قیام کی ضرورت و اہمیت کیا ہے؟ اس کے خدوخال کیا ہوں؟ یہ پہلے ماڈلز سے کیسے مختلف ہوگا؟ ان سوالوں کے تفصیلی جوابات ہم نے موجودہ مضمون میں دینے کی کوشش کی ہے۔ اللہ کرے کچھ لوگ اس سوچ کے مطابق آگے بڑھنے کی کوشش کریں۔ امین

چاہیے۔ اس مجوزہ غیر سیاسی تحریک کا لائحہ عمل اور دائرہ کار کیا ہونا چاہیے، اس ضمن میں ہماری سوچ یہ ہے کہ مجوزہ تحریک تعلیم و تربیت، میڈیا، معیشت، انصاف، امن و امان، اصلاح اخلاق و خدمت خلق کے شعبوں میں گراں قدر خدمات سرانجام دے سکتی ہے۔ ان کاموں کی کچھ تفصیل یہ ہے۔ (جاری ہے)

تعلیم و تربیت

ڈاکٹر محمد امین

ایک نئے رول ماڈل تعلیمی ادارے کی ضرورت

تعلیمی رول ماڈل سے ہماری مراد وہ نمائندہ تعلیمی ادارہ ہے جس کے اصول و مناہج کی پیروی

دوسرے بہت سے تعلیمی ادارے کریں۔ جس طرح مسلمانوں کے تعلیمی ادارے غیر مسلم تعلیمی اداروں کے مقابلے میں بعض منفرد خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں، اسی طرح ایک مسلم ریاست یا معاشرے کے اندر بھی ایسے تعلیمی ادارے ہوسکتے ہیں جو مختلف وجوہ کی بناء پر ایک دوسرے سے مختلف ہوں اور متعدد اسباب کی بناء پر ایک تعلیمی رول ماڈل کی صورت اختیار کر گئے ہوں کہ اس کے بعد جتنے بھی تعلیمی ادارے وجود میں آئیں وہ انہی کے اصول ومناہج کی پیروی کریں۔

انگریزی عہد میں برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں نے جو تعلیمی ادارے قائم کیے، ان میں سے دو یعنی دیوبند اور علی گڑھ تعلیمی رول ماڈل کی حیثیت اختیار کر گئے اور آج جب کہ ان کے قیام کو ڈیڑھ صدی ہونے کو ہے اور تقسیم ہند کے بعد پاکستان کی صورت میں مسلمانوں کی آزاد علیحدہ مملکت کے قیام جیسا عظیم تغیر برپا ہو چکا ہے، اس کے باوجود ان دونوں تعلیمی اداروں کی رول ماڈل ہونے کی حیثیت برقرار ہے، اس کے کچھ اسباب ہیں جو درج ذیل ہیں:

اولاً ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کو شکست دینے کے بعد انگریزوں نے ہندوستان میں مسلمانوں کے تمام تعلیمی، تہذیبی، معاشی، معاشرتی اور قانونی اداروں کو ختم کر دیا اور ان کی جگہ اپنی فکر ونظر کے مطابق نئے اداروں کے قیام کا ڈول ڈالا۔ مسلمانوں کو چونکہ وہ خصوصی طور پر دبانا اور کچلنا چاہتے تھے تاکہ ان کے دوبارہ اٹھ کھڑے ہونے اور ان کے مدمقابل آنے کا کوئی امکان نہ رہے، اس لیے انہوں نے تعلیمی میدان میں خاص طور پر مسلمانوں کو پسماندہ رکھنے کا منصوبہ بنایا۔ چنانچہ مسلمانوں کے تعلیمی اداروں کی عمارتوں، جاگیروں اور تعلیمی اوقاف پر قبضہ کرلیا، ان تعلیمی اداروں سے فارغ التحصیل لوگوں کو سرکاری ملازمتیں دینے سے انکار کردیا اور ملک کے نئے انتظامی ڈھانچے میں حصول ملازمت کے لیے انگریزی زبان اور جدید علوم جاننے کی شرط عائد کردی۔

ثانیاً انگریزی استعمار کے ان اقدامات کے نتیجے میں مسلمانوں کا ردِعمل دو طرح کا تھا۔ دین کا درد رکھنے والے لوگوں نے سوچا کہ ریاست وشوکت تو گئی ہے، نئے تعلیمی نظام سے دین بھی چلا جائے گا لہٰذا کسی طرح دینی علوم کو زندہ رکھنے اور پڑھنے پڑھانے کا انتظام کیا جائے۔ دینی قیادت نے چونکہ انگریز کی مزاحمت سب سے زیادہ کی تھی اور جانی و مالی نقصان بھی اسی کا سب سے زیادہ ہوا تھا اس لیے فطری ردعمل کے طور پر ان کے اذہان وقلوب میں انگریز اور اس کے نظام تعلیم وتہذیب سے نفرت بھی اتنی ہی گہری تھی، چنانچہ انہوں نے ۱۸۶۷ء میں دیوبند میں ایک خالصتاً دینی مدرسے کے

قیام کا انتظام کیا جس میں انہوں نے انگریزی تہذیب اور جدید علوم کا مکمل بائیکاٹ کیا۔

ملی درد رکھنے والے ایک دوسرے مسلم گروہ نے سوچا کہ اگر مسلمانوں نے انگریزی زبان نہ سیکھی اور جدید مغربی علوم سے استفادہ نہ کیا اور انگریز سے مزاحمت کی پالیسی جاری رکھی، تو وہ معاشی اور معاشرتی طور پر تباہ ہو جائیں گے۔ ان کے تجزیے کے مطابق برصغیر کے مسلمانوں کی معیشت کا زیادہ تر انحصار سرکاری ملازمتوں پر تھا کیونکہ تجارت پر تو ہندو بنیے کا غلبہ تھا۔ نیز ان کا یہ خیال بھی تھا کہ اگر مسلمانوں نے انگریزی زبان اور جدید علوم نہ سیکھے تو وہ مغربی تہذیب کی روز افزوں ترقی اور سائنس و ٹیکنالوجی میں اس کی پیش رفت کے مقابلے میں بالکل پسماندہ ہو کر رہ جائیں گے۔ اس نقطۂ نظر کے حامل گروہ نے، جس کے سرخیل سرسید احمد خان تھے، ۱۸۷۵ء میں علی گڑھ کالج قائم کیا (جو ۱۹۲۰ء میں یونیورسٹی کی صورت اختیار کر گیا)۔ سرسید خود دین کے اچھے عالم تھے اور اپنے کالج میں بھی اسلام کا اثر چاہتے تھے لیکن انہوں نے اپنی تعلیمی اسکیم پر کچھ اس طرح عمل درآمد کیا کہ کالج میں انگریز پرنسپل تعینات کیا، اساتذہ کی اکثریت بھی انگریز تھی اور طلبہ کی تربیت انہی کے ہاتھ میں تھی۔ نیز حاصل تعلیم انگریز سرکار کی نوکری سمجھنا اور دل و دماغ پر مغربی فکر و تہذیب کی برتری اور عظمت کا نقش بٹھایا جانا جیسے وہ امور تھے کہ جنہوں نے مذہب اور مذہبی تعلیم کی علی گڑھ میں دال نہ گلنے دی اور بالآخر لبرلزم، سیکولرزم اور مغرب پرستی اس کا مزاج بنا۔

ثالثاً یہ دونوں تعلیمی دھارے اس وقت مسلمانوں کی ضرورت تھے۔ علی گڑھ نے مسلمانوں کی دنیوی ضرورتوں کو پورا کرنا شروع کر دیا اور دیوبند نے مسلمانوں کی دینی ضرورتوں یعنی مسجدوں کو آباد کرنا، ان میں قرآن کی تعلیم اور معاشرتی و مذہبی رسوم و رواج کا بجالانا وغیرہ جیسے امور کو پورا کرنا شروع کر دیا۔ ان وجوہ کی بناء پر یہ دونوں تعلیمی ادارے مضبوط ہو گئے اور ان کی پیروی میں ہزاروں مدارس اور سینکڑوں سکول و کالج ملک بھر میں کھلتے چلے گئے۔ اس طرح یہ دو تعلیمی ادارے دو تعلیمی رول ماڈل بن گئے۔

رابعاً جن علاقوں میں پاکستان بنا وہ پہلے بھی مسلم اکثریت اور مسلم اثر و رسوخ کے علاقے تھے چنانچہ وہاں پہلے سے دیوبند کی طرز کے مدرسے موجود تھے اور انہیں قائم کرنے والے اور ان میں پڑھانے والے اساتذہ اکثر دیوبند ہی کے فیض یافتہ تھے۔ پھر جو نامور علماء کرام تقسیم ہند کے بعد پاکستان آئے انہوں نے یہاں آ کر بڑے بڑے دینی مدرسے قائم کیے۔ ان علماء کی اکثریت چونکہ دیوبند کی تعلیم و

تربیت یافتہ تھی اس لیے انہوں نے دیوبند والا نظامِ تعلیم ہی من وعن رائج کر دیا۔

جدید تعلیم کے میدان میں جو ادارے انگریزی حکومت نے مسلم اکثریتی علاقوں میں قائم کیے جیسے شمالی ہند میں پنجاب یونیورسٹی اور بنگال میں کلکتہ یونیورسٹی وغیرہ تو ظاہر ہے وہاں نظامِ تعلیم کلی طور پر انگریز کے ہاتھ میں تھا اور یہ بھی ظاہر ہے کہ انہیں مسلمانوں کے دین و ایمان اور اصول و اقدار کے تحفظ کی فکر کیوں ہوتی؟ انہیں تو اپنا نظامِ حکومت چلانے کے لیے اچھے کارندے درکار تھے جو انہوں نے ان تعلیمی اداروں میں تیار کرنے شروع کیے۔ جدید تعلیم میں مسلمانوں نے جو مزید تجربے کیے وہ علی گڑھ ہی کی طرز کے تھے۔ ان میں اور انگریز کے قائم کردہ اداروں میں یہ فرق تھا کہ یہاں اسلامیات کا پیریڈ بھی ہوتا تھا اور تحریک پاکستان جیسی ملی تحریکوں سے وابستگی بھی ممنوع نہیں تھی۔ ورنہ جہاں تک تعلیمی اہداف کا تعلق ہے تو ان کے سامنے بھی علی گڑھ کی طرح آکسفورڈ اور کیمبرج ہی ماڈل تھے اور مغرب کی تمدنی ترقی ہی ان کے لیے بھی منارۂ نور تھی۔

ان حالات میں دینی مدارس کی حد تک دیوبند اور جدید تعلیم میں علی گڑھ کا نظام ہی رول ماڈل بنا رہا اور جتنے بھی نئے مدارس اور سکول کالج کھلے وہ ان ہی دونوں ماڈلوں کی نقل تھے اور کسی نے یہ نہ سوچا کہ ایک آزاد اسلامی مملکت کے قیام کے بعد اب حالات کے تقاضے کچھ اور ہیں اور جنہوں نے کچھ سوچا بھی تو محض اشک شوئی اور درخ اندوزی (patch work) سے کام لینا کافی جانا یعنی نظامِ تعلیم میں چھوٹی موٹی اور سطحی تبدیلیاں کر دیں جس نے معاملات کو مزید بگاڑا اور فکری انتشار اور ذہنی خلفشار میں اضافہ کیا۔

یہ وہ چند بڑے اسباب تھے جنہوں نے دیوبند اور علی گڑھ کو ہمارا تعلیمی رول ماڈل بنا دیا اور یہ سلسلہ قیامِ پاکستان کے بعد ابھی تک جاری ہے اور ظاہر ہے کہ اس وقت تک جاری ہے گا جب تک کہ قوم کو ان کے نقائص اور خامیوں کا بخوبی احساس نہیں ہو جاتا اور جب تک کوئی بہتر، موزوں اور متبادل تعلیمی ماڈل ان کے سامنے نہیں آجاتا۔ لیکن پیشتر اس کے کہ ہم آپ کو بتائیں کہ ان دو تعلیمی ماڈلوں کی کورانہ تقلید کی وجہ سے ہماری تہذیبی اور ملی زندگی میں کیا خرابیاں پیدا ہو چکی ہیں اور یہ کہ نیا تعلیمی ماڈل کن اصولوں پر قائم ہونا چاہیے، ہمیں آپ کو یہ بتانا ہے کہ ایک نئے تعلیمی ماڈل کے قیام پر اصرار کر کے ہم کوئی نرالی بات نہیں کر رہے بلکہ خود دیوبند اور علی گڑھ کے بانیوں اور ان کے بعد آنے والے دیگر ماہرینِ تعلیم اور اصحابِ علم و فضل کو بھی ان اداروں کی خامیوں اور نقائص کا احساس رہا

ہے۔ انہوں نے ان خرابیوں کو دور کرنے اور ان کے نقائص سے بچنے کی شعوری کوششیں کی ہیں اور اس غرض کے لیے نئے تعلیمی ادارے قائم کرنے کی بھی جدوجہد کی ہے۔

دیوبند کے قیام اور اس کی تعلیمی پالیسی وضع کرنے والوں میں مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سرفہرست ہیں۔ مولانا گنگوہی قدیم منطق و فلسفہ کے تفصیلی مطالعے کے سخت خلاف تھے اور کہا کرتے تھے کہ ان کے مقابلے میں تو انگریزی پڑھنا بہتر ہے کہ چلو اس سے دنیوی فائدہ تو ہوگا لیکن یہ منطق وفلسفہ پڑھنے کا کوئی دینی فائدہ ہے نہ دنیوی۔ اسی طرح انہیں یہ احساس بھی تھا کہ دیوبند سے فارغ ہونے والے علماء کو انگریزی اور جدید علوم سے بھی واقف ہونا چاہیے۔ چنانچہ انہوں نے دیوبند کے نصاب کو کچھ مختصر کیا اور اس کی مدت تدریس آٹھ سال سے کم کر کے چھ سال کردی تاکہ طلبہ اسی وقت میں جدید علوم سیکھ سکیں اور اس کے لیے انہیں اضافی مدت نہ صرف کرنی پڑے۔ لیکن وائے بدقسمتی کہ اس پروگرام پر عمل نہ ہوسکا اور چند سال کے بعد روایت پسندی کے غلبے نے دیوبند کے نصاب کو پہلی صورت میں بحال کر کے مدت تدریس دوبارہ آٹھ سال کردی اور شیخ الہند مولانا محمود حسن نے تو علی گڑھ والوں سے مل کر باقاعدہ معاہدہ کیا کہ دیوبند سے فارغ ہونے والے علی گڑھ جا کر جدید علوم حاصل کیا کریں گے اور اسی طرح علی گڑھ سے فارغ التحصیل دیوبند آیا کریں گے لیکن سوئے اتفاق کہ شیخ الہند کی بیماری، اچانک وفات اور سیاسی اضطرابات کی وجہ سے اس پروگرام پر بھی عمل درآمد کی نوبت نہ آسکی۔

پھر یہ بات بھی قابل ملاحظہ ہے کہ سرسید کی زندگی ہی میں اہل علم علی گڑھ کی اٹھان اور حاصلات تعلیم سے، خصوصاً دینی حوالے سے، بیزار ہوگئے تھے اور شبلی جیسے آدمی نے علی گڑھ سے علیحدگی اختیار کر کے اور دیگر اہل علم سے مل کر متبادل ادارہ ندوۃ العلماء کے نام سے قائم کیا جس میں پیش نظر یہ تھا کہ دیوبند والی روایت پسندی اور خامیاں اس میں نہ ہوں اور علی گڑھ کے کچھ مثبت اثرات بھی موجود ہوں۔ اس کا خیر مقدم خود سرسید نے بھی کیا۔ یہ ادارہ بنا اور آج تک کام کر رہا ہے اور ملی زندگی پر اس کے مثبت اثرات سے بھی انکار نہیں لیکن بہرحال یہ علی گڑھ اور دیوبند کو جمع کرنے والا تیسرا تعلیمی ماڈل نہ بن سکا اور دینی و عربی علوم ہی کا ایک منفرد ادارہ بن کر رہ گیا۔

پھر جب ۱۹۲۰ء میں تحریک خلافت زوروں پر تھی اور اس کے چلانے والوں میں مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی جیسے علی گڑھ کے فارغ التحصیل بھی تھے تو فطری طور پر انہوں نے کوشش کی کہ علی

گڑھ کا وزن اس تحریک کے پلڑے میں پڑے لیکن انگریز اساتذہ کی نگرانی میں علی گڑھ کا ماحول مغرب پرستی اور ماڈرنزم کے رنگ میں رنگا ہوا تھااور انگریزی حکومت میں ملازمت کا حصول ہی طلبہ کا منتہائے مقصود بن کر رہ گیا تھا۔ چنانچہ تحریک خلافت کے حق میں علی گڑھ کے اندر اور باہر تحریک چلی لیکن جب اہل دانش و سیاست علی گڑھ کو انگریزوں کے خلاف تحریک میں متحرک نہ کرسکے تو انہیں بڑی مایوسی ہوئی اور انہوں نے سوچا کہ ایسی قومی یونیورسٹی بنانے کا کیا فائدہ جو قومی اہداف اور ملی عزائم کی پشتیبانی نہ کرسکے۔ چنانچہ جنوری ۱۹۲۰ء میں علی گڑھ کے یونیورسٹی ڈیکلیئر ہونے سے پہلے مولانا محمد علی، حکیم اجمل، ابوالکلام آزاد اور دوسرے قائدین نے جامعہ ملیہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا اور علی گڑھ ہی میں اس کا قیام عمل میں لایا گیا اور اس کا افتتاح دیوبند کے مہتمم شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے ہاتھوں ہوا (گو بعد میں یہ دہلی منتقل ہوگئی اور آج تک وہیں ہے) اور علی گڑھ کے طلبہ اور اساتذہ کی ایک کھیپ اس نئی یونیورسٹی میں چلی گئی۔ لیکن یہ ایک الگ داستان ہے کہ جامعہ ملیہ بھی علی گڑھ کی خامیوں سے مبرا ہوکر اور دینی تعلیم کو شامل کرکے تیسرا تعلیمی ماڈل پیش نہ کرسکی اور آج بھی پبلک سیکٹر کی ایک عام ہندوستانی یونیورسٹی کی طرح کام کر رہی ہے۔

متبادل اداروں کے قیام کے علاوہ اصلاح نصاب کی کوششیں بھی ہوتی رہیں۔ چنانچہ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے دیوبند کے نصاب میں اصلاح کی جو کوشش کی، اس کا ذکر ابھی ہوا، اس کے علاوہ علامہ شبلی نعمانیؒ، مولانا ابوالکلام آزادؒ بلکہ خود حلقہ دیوبند کے اپنے لوگوں میں سے مولانا مناظر احسن گیلانیؒ، مولانا سعید احمد اکبرآبادیؒ، قاضی زین العابدین سجادؒ اور دوسرے بہت سے علماء کرام درسِ نظامی کے موجودہ نصاب پر تنقید کرتے اور اس میں اصلاح کی تجاویز دیتے رہے ہیں۔ مولانا عبیداللہ سندھی نے تو شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے مشورے سے دہلی میں ۱۹۱۳ء میں ایک ادارے "نظامت المعارف" کی بنیاد رکھی تاکہ دیوبند اور علی گڑھ کے فکری امتزاج اور اصلاح کی کوشش کی جاسکے۔ لیکن سیاسی حالات کے دباؤ اور مولانا کی سیمابی طبیعت کی وجہ سے کوئی بڑا کام نہ ہوسکا۔ خود دارالعلوم دیوبند نے ۱۹۲۸ء میں اعلان کیا کہ فلسفہ کی جدید کتب داخل درس کی جائیں گی لیکن اس پر بھی عمل نہ ہوسکا۔ مولانا حسین احمد مدنیؒ کے آخری زمانے میں پھر نصاب پر نظر ثانی کی تحریک شروع ہوئی اور دارالعلوم کی مجلس شوریٰ نے باضابطہ ایک کمیٹی اس مقصد کے لیے تشکیل دی جس نے نصاب میں کئی ترمیمات کی رائے دی اور قدیم علوم عقلیہ کو کم کرکے انگریزی اور علوم جدیدہ کو اس میں شامل کرنے کی

سفارش کی، لیکن بعض وجوہ سے اس کمیٹی کی سفارشات پر بھی عمل نہ ہوسکا گو اس کی ضرورت برابر محسوس کی جاتی رہی۔

مذکورہ بالا چند واقعات سے یہ اندازہ بہرحال ہوجاتا ہے کہ برصغیر کے اہلِ دانش اور اہل تعلیم کو اس امر کا بخوبی احساس تھا کہ جن اصولوں پر دیوبند اور علی گڑھ کام کررہے ہیں وہ یک طرفہ اور انتہا پسندی پر مبنی ہیں اور ان میں اصلاح کی ضرورت ہے لیکن اسے بدقسمتی کہیے یا حالات کی ستم ظریفی کہ جب برصغیر کی ملت اسلامیہ غلام تھی تو اپنے ملی وقومی آدرشوں کے حصول کے لیے متحرک اور منظم تھی لیکن جب ۱۹۴۷ء میں مملکت خداداد وجود میں آگئی تو اس نے سمجھ لیا کہ ہمارا کام گویا ختم ہوگیا اور اب یہ نوزائیدہ اسلامی مملکت کا کام ہے کہ وہ تعلیم کی اصلاح اور پشتیبانی کا کام کرے۔ چنانچہ ملی سطح پر جو حرکت اور دلچسپی تعلیم و تربیت کے میدان میں تھی وہ ختم ہو کر رہ گئی۔ دوسری طرف پاکستانی حکومتوں نے جو رویہ اختیار کیا وہ مایوس کن تھا۔ تعلیمی نظام کو اسلامی ضروریات اور عصری تقاضوں کے مطابق ڈھالنے میں کسی پاکستانی حکومت نے کبھی خاطر خواہ دلچسپی نہیں لی، چنانچہ دیوبند اور علی گڑھ کی ثنویت آج بھی پہلے کی طرح زور و شور سے جاری ہے۔ دینی مدارس آج بھی دیوبند والی روایت پسندی پر عامل ہیں اور جدید تعلیم کے سکول و کالج اور یونیورسٹیاں آج بھی علی گڑھ والی مغرب پرستی اور دین سے عدم اعتناء والی پالیسی پر گامزن ہیں کیونکہ ان کے نزدیک آج بھی مغربی فکر وتہذیب ہی ترقی کا سرچشمہ اور اعلیٰ ترین تہذیب وتمدن کا مظہر ہے۔ ان حالات میں ان سے توقع کی بھی نہیں جا سکتی کہ وہ تعلیم کی اسلامی تشکیل نو کا کام کریں گے۔

بہرحال یہ تو ماضی کا ایک جائزہ تھا۔ ہمیں جو کہنا ہے وہ یہ ہے کہ جو کام ہم کل نہیں کر سکے وہ آج کرنے کا عزم کیوں نہ کریں؟ اور خیر کے تعمیری کاموں میں تاخیر کو ہماری قوت عمل کو مہمیز کرنے کا سبب بننا چاہیے نہ کہ مایوسی و دل گرفتگی کا، کہ ہاتھ چھوڑ کر بیٹھے رہیں، خصوصاً یہ دیکھتے ہوئے کہ تعلیم کی موجودہ صورت ہمارے لیے عظیم ملی نقصانات کا سبب بن رہی ہے۔ ان نقصانات کی کچھ تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ عمومی تعلیم یا جدید تعلیم جو قوم کا ہر بچہ حاصل کرتا ہے اس میں دینی تعلیم کا ضروری مواد شامل نہیں ہے یعنی وہ مواد اپنی کیفیت و کمیت یعنی مقدار اور کوالٹی میں ایسا نہیں ہے جو ہماری دینی ضروریات بطریق احسن پوری کرے۔ اس کے علاوہ جو چیز ناگزیر تھی وہ یہ کہ باقی سارے جدید علوم و مضامین کو

اسلامی تناظر میں مرتب کر کے پڑھایا جاتا، اس لیے کہ ان علوم کا فکری منبع مغرب کی لادین فکر و تہذیب ہے لیکن اس کی طرف کسی حکومت نے آج تک توجہ ہی نہیں دی۔ پھر اس پر مستزاد یہ کہ طلبہ کی اسلامی نقطۂ نظر سے تربیت کا کوئی تصور جدید تعلیم میں موجود ہی نہیں۔ خلاصہ یہ کہ ہماری جدید تعلیم نہ تو ہمارے بچوں کو اچھا مسلمان بناتی ہے اور نہ انہیں ضروری دینی علم دیتی ہے۔

۲۔ دینی مدارس کا نظام وہی پرانا درس نظامی ہے جس میں زیادہ زور علوم آلیہ پر ہے۔ دینی علوم وہاں پڑھائے جاتے ہیں تو پرانے اسلوب اور لوازمہ کے ساتھ اور عصری علوم کا تو وہاں گزر ہی نہیں۔ اولاً تو دینی مدارس کو اس منہج پر لوٹ جانا چاہیے جو اسلاف کے زمانے میں یا خود ہندوستان میں انگریز کے آنے سے پہلے تھا یعنی وہ ریاست اور معاشرے کے لیے کارکن تیار کرتے تھے یا کم از کم پہلے مرحلے میں دینی مدارس کے ہر طالب علم کو جدید علوم کا تعارفی مطالعہ ضرور کرانا چاہیے تاکہ اسے یہ تو پتہ چلے کہ جس دنیا میں وہ رہ رہا ہے وہ کیا سوچتی ہے اور کیونکر سوچتی ہے؟ پھر مرحلۂ تخصص میں کچھ لوگ ایسے بھی ہونے چاہئیں جو مختلف جدید علوم میں مہارت رکھتے ہوں تاکہ وہ زندگی کے مختلف شعبوں میں دینی رہنمائی کی تفصیلات ماہرانہ انداز میں سامنے لاسکیں۔ اس وقت کیفیت یہ ہے کہ دینی مدارس سے فارغ ہونے والے طالب علم کو پتہ ہی نہیں ہوتا کہ عصر حاضر کیا ہے اور اس کے تقاضے اور چیلنج کیا ہیں اور ان سے کیسے عہدہ برآ ہوا جاسکتا ہے؟ نتیجہ یہ ہے کہ وہ معاشرے پر، خصوصاً اس کے پڑھے لکھے طبقے پر جو معاشرے کی ریڑھ کی ہڈی ہے، اثر انداز نہیں ہوسکتا۔ وہ جس ذہنی فضا میں رہ کر مسجد کے منبر پر بیٹھ کر گفتگو کرتا ہے، اس کے سامعین کی ذہنی فضا اس سے مختلف ہوتی ہے جس کے نتیجے میں ان کے درمیان بامعنی اور سنجیدہ ڈائیلاگ ہوتا ہی نہیں۔ ہمارے علماء اور عوام، خصوصاً پڑھے لکھے اور جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے درمیان جو ذہنی، فکری، معاشرتی اور معاشی بُعد ہے اور جو دن بدن بڑھ رہا ہے، اس نے دین کو ایک قابل عمل اور زندہ حقیقت نہیں رہنے دیا بلکہ وہ ایک یوٹوپیا بن کر رہ گیا ہے۔

۳۔ مندرجہ بالا ثنویت کا نتیجہ یہ ہے کہ اسلام میں دین اور دنیا کی تفریق اور ان کے الگ الگ ہونے کے مرض کو بہت تقویت حاصل ہوئی ہے، علماء اور عوام کے درمیان فاصلہ بڑھا ہے اور اسلام کے قابل عمل ہونے اور معاشرے کی عملی رہنمائی کرنے کے عمل کو بالواسطہ طور پر بہت زک پہنچی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ دین پر عمل کرنے والے ہر آدمی کو مولوی اور عجوبہ سمجھا جاتا ہے جو ایک عام دنیا دار مسلمان سے الگ مخلوق ہوتی ہے اور عام معاشرے میں ناقابل قبول (misfit) ہوتی ہے۔ اس

صورت حال سے زندگی کے مرکزی اور مجموعی دھارے(mainstream life) کے اسلام سے قریب آنے کی بجائے نیکی کے جزیرے وجود میں آنے شروع ہو گئے ہیں اور یہ جزیرے بھی دن بدن سکڑ رہے ہیں۔

۴۔ اس کا ایک بڑا نقصان یہ ہے کہ ایک موحد، معتدل اور یکسو شخصیت (Anintegrated and balanced personality)وجود میں نہیں آسکی۔ دین و دنیا کی عدم آہنگی اور تفریق نے فکری انتشار اور ژولیدگی کو پروان چڑھایا ہے اور انتہا پسندی کو ترقی دی ہے۔ ایک عام آدمی جب مذہب کی گرفت میں آتا ہے تو وہ اپنی پہلے کی زندگی کو یکلخت ترک کر کے ایک دوسری انتہا پر پہنچ جاتا ہے یا ایک دیندار آدمی اپنی دینداری کے سارے مظاہر کے باوجود اندر سے ایک سخت دنیا دار آدمی بن جاتا ہے جس کے اندر دین کی حقیقی روح اور رمق باقی نہیں رہتی۔اس دو رخے پن اور منافقت کے اژدھے نے ہمارے ملی وجود کو جکڑ کر بے دست و پا بنا دیا ہے۔جس کا انجام بالآخر موت ہے۔

۵۔ آج مغرب کی فکر اور تہذیب ایک غالب اور برتر تہذیب ہے۔ اس کا غلبہ سیاسی، معاشی اور عسکری ہی نہیں فکری بھی ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ اس کا شعوری طور پر ادراک نہ کرنا اور اس کے توڑ کی فکر نہ کرنا خودکشی کے مترادف ہے۔ آج ہمارے تعلیمی نصابات بلکہ تعلیم و تربیت کا سارا ڈھانچہ مغربی افکار کے سائے تلے پروان چڑھ رہا ہے۔ اس کے دفعیے کے لیے نہ صرف مضبوط دفاعی اقدامات کی ضرورت ہے بلکہ اس کے لیے مثبت ہجومی پیش رفت کی ضرورت بھی ہے لیکن اوپر ذکر کردہ تعلیمی ثنویت نے ہمارے نظام تعلیم کو مغربی تہذیب کے لیے لقمۂ تر بنا کر رکھ دیا ہے۔

۶۔ تزکیہ و تربیت ہر نظام تعلیم کی جان ہوتے ہیں بلکہ تزکیہ تو دین کا مرکزی نقطہ اور جوہر ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر اسی لیے بھیجتا ہے کہ وہ لوگوں کے نفوس کا تزکیہ کریں تا کہ وہ ہدایت پا کر اللہ کے احکام کی اطاعت کرتے ہوئے زندگی گزاریں اور دنیا و آخرت دونوں میں سرخرو ٹھہریں اور قرآن حکیم میں ہے کہ اللہ نے اپنا آخری پیغمبر بھی لوگوں کے تزکیے ہی کے لیے مبعوث فرمایا تھا۔ مسلمان اہل علم و صلاح نے صدر اسلام میں جب لوگوں کے اندر ایمانی و اخلاقی کمزوریوں کو جڑ پکڑتے دیکھا تو تزکیہ و تربیت کے لیے اجتماعی کوششیں شروع کر دیں جو بالآخر تصوف کے نام سے ایک وسیع ادارے اور تحریک کی شکل اختیار کر گئیں۔ اگرچہ اس میں جلد ہی بہت سی غیر اسلامی رسوم و رواج اور افکار دخیل

ہو گئے لیکن اس کے باوجود صدیوں تک مسلم تاریخ میں اگر مدارس نے تعلیم مہیا کی تو خانقاہوں نے تزکیہ وتربیت کا سامان مہیا کیا۔ آج نیا زمانہ ہے نہ وہ قدیم مدارس رہے نہ خانقاہیں لیکن کیا ہمیں تزکیہ وتربیت کی ضرورت بھی نہیں رہی؟

آج کی جدید تعلیم میں اسلامی تزکیہ وتربیت کا تصور راہ ہی نہیں پا سکا۔ کیا اس کی موجودگی کی ضرورت اہل فکر ونظر محسوس نہیں کرتے؟ کیا اس وقت ہمارے ہاں جو فکری انارکی، اخلاقی انحطاط اور سیرت وکردار کا بحران پایا جاتا ہے اس کی یہی بڑی وجہ نہیں کہ جو بچے ہمارے سکولوں کالجوں میں آتے ہیں ہم انہیں پڑھنا لکھنا تو سکھا دیتے ہین لیکن ان کی اخلاقی تربیت نہیں کرتے، انہیں اچھا انسان اور اچھا مسلمان بنانے کی تگ ودو نہیں کرتے؟ کیا ہمارے تربیت اساتذہ کے اداروں میں اساتذہ کو یہ سکھایا جاتا ہے کہ طلبہ کو اچھا مسلمان کیسے بنایا جائے؟ کیا ہمارے علماء وصلحاء کو اس کی فکر ہے کہ نئی نسل کے بگڑے اخلاق کیسے سنوریں گے، کہاں سنوریں گے اور انہیں کون سنوارے گا؟

تو مختصر الفاظ میں یہ وہ چیدہ چیدہ خامیاں ہیں جو ہمارے موجودہ تعلیمی رول ماڈلز کی پیروی میں ہمارے تعلیمی اداروں میں سرایت کیے ہوئے ہیں۔ ان سے ایک بات پوری طرح واضح ہو کر ہمارے سامنے آجاتی ہے کہ ہمارے زوال اور نکبت کا بڑا سبب ہمارا یہ ناکارہ نظام تعلیم ہی ہے۔ یہی ساری خرابیوں کی جڑ ہے اور اس نظام تعلیم کی خرابیوں کا بڑا سبب اس کی ثنویت اور دوئی ہے یعنی علی گڑھ اور دیوبند کو تعلیمی رول ماڈل سمجھنا اور آنکھیں بند کر کے ان کی پیروی کیے چلے جانا۔ لہٰذا وقت کی اہم ترین ضرورت یہ ہے کہ ان دونوں تعلیمی ماڈلوں سے جان چھڑائی جائے اور ایک نیا تعلیمی ماڈل کھڑا کیا جائے جس میں ان دونوں کی خوبیاں تو ہوں لیکن ان کی خامیاں اور نقائص نہ ہوں۔ جو ہماری دینی ضروریات بھی پوری کرے اور عصر حاضر کے چیلنج سے نمٹنے اور ہمارے آج کے مسائل حل کرنے کا بھی اہل ہو۔ وہ ایسی متوازن اور یکسو شخصیت پروان چڑھائے جو اعلیٰ اخلاق وکردار کی حامل ہو، دینی تعلیمات سے واقف اور ان پر عامل ہو اور ساتھ ہی جدید سماجی اور سائنسی علوم سے بھی خوب واقف ہو اور جو بیک وقت دنیا اور آخرت میں کامیابی اور سربلندی کے لیے جدوجہد کر سکے۔

نئے تعلیمی ماڈل کے خدوخال کیسے ہونے چاہئیں؟ اگرچہ مذکورہ بالا بحث میں ان کی کافی حد تک نشاندہی ہو چکی ہے تاہم پھر بھی مزید وضاحت کی خاطر ہم اس کے بارے میں مختصراً کچھ عرض کیے دیتے ہیں:

نئے تعلیمی ماڈل کے خدوخال

۱۔ اس کی نظریاتی سمت متعین ہوگی کہ اس کا مقصد طلبہ کو اچھے، عملی اور کامیاب مسلمان بنانا ہے تاکہ وہ دنیا کی زندگی الٰہی تعلیمات کے مطابق گزار سکیں اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرسکیں، جو ہر مسلمان کا مقصد حیات ہے اور جس کے نتیجے میں دنیا میں بھی خوشی، عزت اور سربلندی حاصل ہوتی ہے۔

۲۔ اس میں تعلیمی ثنویت نہ ہوگی اور نہ جدید وقدیم کا جھگڑا ہوگا۔ عام تعلیم اس طرح دی جائے گی کہ دنیوی علوم کے ساتھ دینی تعلیمات کا بھی اس میں معتدبہ حصہ ہوگا۔اسی طرح جو طلبہ دینی علوم میں خصوصی مہارت (تخصص) حاصل کرنا چاہیں گے، وہ جدید دنیوی علوم کا تعارفی وتقابلی مطالعہ بھی لازماً کریں گے۔

۳۔ تزکیہ وتربیت اس تعلیمی ادارے کے نظام تعلیم کا لازمی حصہ ہوں گے۔اس تربیت کے دو حصے ہوں گے ایک عمومی تربیت جس میں بنیادی انسانی صلاحیتوں کو جلا دی جائے گی جیسے صفائی، وقت کی پابندی، نظم و ضبط کی عادت، تقریری وتحریری صلاحیتوں میں اضافہ، کھیلوں میں حصہ لینا وغیرہ، دوسرے خصوصی تربیت جس میں طلبہ کو اللہ تعالیٰ کی تعلیمات کے مطابق زندگی گزارنے کا سلیقہ سکھایا جائے گا۔ ان دونوں طرح کی تربیت کے لیے ایک بھرپور تربیتی پروگرام بنایا جائے گا۔ تربیتی نظم ہوگا۔ ہفتہ وار، ماہانہ اور سالانہ منصوبہ بندی ہوگی۔ ہر طالب علم کی الگ فائل ہوگی۔ اس غرض کے لیے نصاب میں تبدیلی ہوگی۔ اساتذہ کی خصوصی تربیت کی جائے گی۔تربیت کا باقاعدہ امتحان ہوگا،جس میں پاس ہونا لازمی ہوگا۔تربیتی سرگرمیوں کا وزن اور اہمیت تعلیمی سرگرمیوں سے کسی طرح کم نہ ہوگی۔

۴۔ نیا نصاب بنایا جائے گا اور نئی کتابیں لکھی جائیں گی۔ نئے نصاب کے راہنما اصول یہ ہوں گے:

i) اس میں جدید دنیاوی اور دینی علوم موزوں امتزاج کے ساتھ موجود ہوں گے۔

ii) جدید علوم اسلامی تناظر میں مدون کیے جائیں گے۔

iii) مغربی علوم کا تنقیدی اور تقابلی مطالعہ کیا جائے گا۔

iv) ہر مسلمان طالب علم کو اتنا دینی علم ضرور دیا جائے گا جتنا ایک عام مسلمان کے لیے ضروری ہوتا ہے۔

v) تربیت کا موضوع اور مواد بھی نصاب کا حصہ ہوگا۔

vi) اس میں بچوں کی عمر اور پاکستانی معاشرت کا لحاظ رکھا جائے گا۔

vii) اس میں اصرار انسان سازی اور سماجی علوم پر ہوگا تاہم سائنس اور ٹیکنالوجی کو بھی پس پشت نہیں ڈالا جائے گا۔

۵۔ اساتذہ کی تربیت کا خصوصی انتظام ہوگا تاکہ ان کو بتایا جاسکے کہ نہ صرف بچوں کو عمدہ تعلیم احسن انداز میں دینی ہے بلکہ یہ بھی کہ ان کی تربیت کر کے ان کو اچھا انسان اور اچھا مسلمان کیسے بنانا ہے؟

۶۔ تعلیم گاہ کا ماحول بچوں کی تربیت میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ اس تعلیم گاہ کا ماحول ایسا بنایا جائے گا جو تزکیہ و تربیت میں مددگار ہو۔ اس کے لیے ہم نصابی و غیر نصابی سرگرمیوں کا وسیع نیٹ ورک قائم کیا جائے گا جس سے نہ صرف طلبہ کی بنیادی انسانی صلاحیتوں کو جلا بخشی جائے گی بلکہ عملی اقدامات کے ذریعے انہیں اطاعت الٰہی کا خوگر بھی بنایا جائے گا (تعلیمی اداروں میں طلبہ کی اسلامی تربیت کیسے کی جائے؟ اس پر ہماری ایک پوری کتاب موجود ہے)۔

۷۔ طلبہ کو فکری حریت کا درس دیا جائے گا، سوال پوچھنے کی حوصلہ افزائی کی جائے گی اور ان کے جذبہ تجسس کو ابھارا جائے گا۔ بڑی عمر کے طلباء کو تحقیق کا خوگر بنایا جائے گا اور تحقیق میں بھی تخلیقیت کو اہمیت دی جائے گی۔

۸۔ بہترین کارکردگی (Excellence) ہر سطح پر اس تعلیمی ادارے کا ماٹو ہوگا۔ طلبہ اور اساتذہ کے اندر مسابقت کا ماحول پیدا کیا جائے گا۔ صرف ذہین، محنتی اور لائق طلبہ کو داخلہ دیا جائے گا۔ اسی طرح صرف ذہین، محنتی اور لائق اساتذہ کو تعلیم و تربیت کی ذمہ داری سونپی جائے گی جو اس کام کو مشن کے طور پر سرانجام دیں گے۔

۹۔ اس ادارے کا مطمح نظر نفع اندوزی اور پیسے کمانا نہیں ہوگا۔ وہ طلبہ ہی کو نہیں اساتذہ کو بھی اعلیٰ اخلاقی اور دینی نصب العین دینے کی جدوجہد کرے گا۔

۱۰۔ یہ ادارہ اصلاح تعلیم کے جن اصولوں پر قائم ہوگا انہیں معاشرے میں برپا کرنے کے لیے بھرپور جدوجہد کرے گا تاکہ وہ محض تعلیمی ادارہ نہ رہے بلکہ نظام تعلیم و تربیت کی اسلامی تشکیل نو کرتے ہوئے تجدید تعلیم و تربیت کی تحریک بن جائے اور اصلاح فرد اور اصلاح ملت میں اہم کردار ادا کرسکے۔

نئے رول ماڈل کا قیام

یہ وہ چند اصول ہیں جن پر نئے تعلیمی ماڈل کی بنیاد رکھی جانی چاہیے۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ جو لوگ نظام تعلیم و تربیت کی اہمیت سے واقف ہیں کہ یہ اصلاحِ فرد اور اصلاحِ اجتماعی میں کتنا

بڑا کردار ادا کرسکتی ہے، جو مروجہ تعلیمی نظام کی خرابیوں سے آگاہ ہیں اور ان سے بچنے کے لیے اس کی اسلامی تشکیل نو چاہتے ہیں، انہیں چاہیے کہ وہ اٹھ کھڑے ہوں اور اس نئے تعلیمی ماڈل کو قائم کرنے کی جدوجہد میں لگ جائیں۔ اس نئے ماڈل کے لیے ایک اقامتی یونیورسٹی بننی چاہیے اور ایک ماڈل سکول اور ایک ماڈل مدرسہ (یا اسلامک سنٹر) اس کا حصہ ہونا چاہیے۔ اگر کل ہم دیوبند اور علی گڑھ جیسے تعلیمی ماڈل قائم کرسکتے تھے تو آج ایک تیسرا تعلیمی ماڈل کیوں کھڑا نہیں کرسکتے؟ اصل ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم یکسو ہوکر اس کام میں لگ جائیں اور اللہ سے نصرت طلب کرتے رہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم کامیاب نہ ہوں کہ اس کا وعدہ ہے کہ جو اس کی راہ کا جویا ہو وہ اسے سیدھی راہ ضرور دکھاتا ہے اور جو اس کی طرف بڑھے وہ اس کا ہاتھ ضرور پکڑتا ہے اور جس کی نصرت پر وہ کمربستہ ہوجائے دنیا کی کوئی طاقت اس کی کامیابی کا راستہ نہیں روک سکتی۔

تعلیم و تربیت عطاء محمد جنجوعہ

اسلامی تعلیم کا خاکہ

ہر حاکم قوم اپنے تمدن کی اشاعت اور نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کے لیے سب شعبوں سے بڑھ کر تعلیم پر توجہ دیتی ہے۔ سامراجی طاقتوں نے نوآبادیاتی دور میں مسلمانوں کو مستقل غلام بنانے کے لیے مخصوص تعلیمی پالیسی تشکیل دی جس سے مسلمان ان کے ذہنی غلام بن کر رہ گئے اور ان سے اسلامی روح چھین لی گئی اور تعلیم کا مقصد برائے اصلاح ختم ہوکر حصولِ معاش روزگار تک محدود ہوگیا ہے۔ لارڈ میکالے نے ۱۸۳۴ء میں اپنے نظامِ تعلیم کے بارے میں پیشین گوئی کی تھی کہ اس کے فضلاء ''رنگ اور نسل کے اعتبار سے دیسی ہوں گے لیکن خیالات اور تمدن میں انگریز ہوں گے''۔ اسلامی ممالک کو سامراجی قوتوں سے جغرافیائی آزادی حاصل کیے ہوئے طویل عرصہ گزر چکا ہے مگر ان کا نظامِ تعلیم آج بھی سیکولر ذہن کی عکاسی کرتا ہے۔ اسلامی اداروں اور حکومت کا فرض ہے کہ نظامِ تعلیم کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے لیے ضروری اقدامات کرے تاکہ مسلمان علم و تحقیق میں کھویا

ہوا مقام دوبارہ حاصل کرسکیں۔آج کے مسلمان معاشرے میں تعلیم کیسی ہونی چاہیے اس بارے میں ہماری تجاویز درج ذیل ہیں:

۱۔ اسلام سے عدم دلچسپی، ترقیاتی منصوبوں کی ناکامی، سیاسی شعور کی کمی اور اہلِ مغرب کی اندھی تقلید کا سبب تعلیم کی کمی ہے۔ اسلامی ممالک میں خواندگی کا تناسب دوسروں کی نسبت کم ہے جب کہ قوم کی بقاء کا انحصار تعلیم وتربیت پر ہے۔ نئی نسل کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنا والدین اور حکومت کا فریضہ ہے۔ تعلیم عام کرنے کے لیے بنیادی تعلیم لازمی کردی جائے تاکہ نوخیز پودا پروان چڑھ کر ملّی، قومی اور عالمی مسائل سے آگاہ ہوسکے اور اپنی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر قومی ترقی میں اہم کردار ادا کرسکے۔

۲۔ ناظرہ قرآن کی تعلیم لازمی ہو۔ ابتدائی تعلیم کے آخر میں عملی امتحان میں پاس ہونا ضروری قرار دیا جائے۔

۳۔ اسلامیات میں ارکانِ اسلام اور اخلاق وآداب شامل ہو۔ نماز، ادعیہ مسنونہ اور قرآن مجید کی چند سورتیں اور ترجمہ شامل نصاب ہوں اور عربی گرامر کا ابتدائی تعارف ہو۔

۴۔ ناظرہ قرآن اور اسلامیات کی تدریس کے لیے ہر ابتدائی سکول میں فاضل عربی یا وفاق المدارس کے فارغ التحصیل عالم کی آسامی ہو اور حافظِ قرآن کو ترجیح دی جائے جس کی تنخواہ عام مدرس سے کم نہ ہو۔

۵۔ پرائمری سطح تک تعلیم مفت دی جائے۔ نصابی کتب ارزاں نرخوں پر دستیاب ہوں۔

۶۔ خواندگی کی شرح میں اضافہ کے لیے محلہ کی مساجد میں تعلیم بالغاں کے مراکز قائم کیے جائیں جن میں ابتدائی تعلیم کا نصاب مکمل کرایا جائے۔

۷۔ نصابی یا تدریسی زبان قومی ہو (ملّی زبان عربی ہو)۔

۸۔ غیر ملکی، مشنری اور پرائیویٹ تعلیمی اداروں میں قومی نصاب رائج کیا جائے۔

۹۔ غیر مسلموں کو مذہبی تعلیم حاصل کرنے کے لیے سکول قائم کرنے کی اجازت ہو جن میں مسلمان طلباء کا داخلہ ممنوع ہو۔

۱۰۔ ملک کے تمام تعلیمی اداروں کا نصاب یکساں ہو۔

۱۱۔ بی اے کے معیار تک عربی کی تدریس لازمی کر دی جائے۔عربی کا نصاب سہل ہو جو قرآن و حدیث پر مشتمل ہو لیکن گرامر کی مشق شامل ہو۔

۱۲۔ انگریزی زبان بین الاقوامی زبان ہے۔موجودہ دور میں اس کی افادیت سے انکار ممکن نہیں لہٰذا اس کی حوصلہ افزائی کی جائے لیکن یہ اختیاری ہو تا کہ دوسرے علوم میں اعلیٰ مہارت حاصل کرنے میں آڑے نہ آئے۔

۱۳۔ دفتری امور قومی زبان میں منتقل کیے جائیں۔جن محکموں کے معاملات انگریزی زبان میں ناگزیر ہوں مثلاً امورِ خارجہ، سائنس وٹیکنالوجی وغیرہ ان محکموں میں بھرتی کے لیے محکمانہ اہلیت کے علاوہ انگریزی میں کامیابی لازمی قرار دی جائے۔

۱۴۔عورتوں کے اسلامی گروپ میں تاریخ صحابیات، تہذیب نسواں، اصولِ صحت اور انسانی تعمیر میں عورتوں کا کردار جیسے مضامین کا اضافہ ہو۔

۱۵۔ مخلوط نظامِ تعلیم ختم کیا جائے اور خواتین کے لیے علیحدہ یونیورسٹیاں اور فنی ادارے قائم کیے جائیں۔ان اداروں سے متعلق محکمانہ تربیت اور محکمانہ امور سرانجام دینے کے لیے عملہ خواتین پر مشتمل ہو۔

۱۶۔ آرٹس گروپ کے مضامین سیاسیات، معاشیات، عمرانیات اور نفسیات ہوں۔فلسفہ میں اسلامی وغیر اسلامی نظریات کا تقابلی جائزہ پیش کر کے ملحدانہ نظریات کی تردید کی جائے اور اسلام کے ہمہ گیر آفاقی اصولوں کو اجاگر کیا جائے مثلاً سود کے مضمرات اور زکوٰۃ کے ثمرات۔

۱۷۔ فنی و سائنسی علوم کو قومی زبان میں ڈھالا جائے۔تجربات کے لیے وافر مقدار میں ضروری سامان مہیا کیا جائے۔اس شعبہ میں ذہین طلباء کو خصوصی الاؤنس دیا جائے۔

۱۸۔ ابتدائی سطح سے اعلیٰ سطح تک زیرِ تعلیم طلباء پر سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے پر پابندی ہو۔ نیز کسی قسم کے سیاسی مظاہروں میں شامل ہونے والے طلباء اور مظاہرہ کرنے والی تنظیموں کو سختی سے روکا جائے۔

۱۹۔ دورانِ تعلیم بچوں کی تعلیم وتزکیہ کا خصوصی انتظام کیا جائے۔انہیں صوم وصلوٰۃ کا پابند بنایا جائے۔درس

گاہ سے فارغ ہوتے وقت طلبہ کے چال چلن کے سر ٹیفکیٹ میں یہ تصدیق لازمی ہو کہ وہ پابند صلوٰۃ ہے۔

۲۰۔ غیر مسلم علاقوں میں مسلم طلباء کو فنی و سائنسی تحقیق کے سوا قطعاً نہ بھیجا جائے۔ وہاں ان کی رہائش کا خصوصی انتظام کیا جائے تاکہ اسلامی تشخص کو برقرار رکھ سکیں اور دوسروں کے لیے علم وعمل کا عمدہ نمونہ ہوں۔ دوسرے اسلامی ممالک سے آئے ہوئے مسلمان طلباء سے رابطہ قائم کریں، شرعی و عقلی علوم پر تبادلہ خیال کریں اور عالمِ اسلام کو درپیش مسائل کے حل کے لیے حتی المقدور کوشش کریں۔

۲۱۔ تعلیمی درس گاہوں میں اساتذہ کا معیارِ زندگی بہتر بنانے کی کوشش کی جائے تاکہ علم وعمل کے پیکر اور ذہین طلبہ شعبۂ تعلیم کی طرف رجوع کریں۔ حاضر سروس اساتذہ کو فنی تربیت کے علاوہ تعلیم و تزکیہ کا کورس کرایا جائے جس میں بحیثیت معلم ان کو اخلاقی ذمہ داریوں کا احساس دلایا جائے۔ نااہل اور بے عمل اساتذہ کو برطرف کر کے انہیں دوسرے محکموں کے سپرد کیا جائے۔

۲۲۔ مسلمانوں کے ابتدائی دور کی درس گاہوں میں بچوں کو تیراندازی، تیغ زنی اور گھڑسواری کی مشق کرائی جاتی تھی۔ موجودہ دور میں طلباء کے لیے فوجی تربیت لازمی کر دی جائے۔

۲۳۔ تعلیمی اداروں میں دارالمطالعہ کو مؤثر اور جاندار بنایا جائے۔ ہر جماعت کے ٹائم ٹیبل میں دارالمطالعہ کے لیے ہفتہ وار چند پیریڈ مخصوص ہوں۔ طلباء کے زیر مطالعہ کتب کو رجسٹر میں درج کیا جائے۔

۲۴۔ میٹرک سے بی اے تک تعلیمی اداروں میں سائنس و آرٹس گروپ کی طرز پر اسلامی گروپ قائم کیا جائے۔ اسلام مکمل اور جامع ضابطۂ حیات ہے۔ زندگی کے تمام شعبوں میں ہماری راہنمائی کرتا ہے۔ اسلامی گروپ کے مضامین تفسیر القرآن، معارف الحدیث، علم الفقہ، تاریخ اسلام، اتحاد اسلامی، اسلامی دنیا، سیرت طیبہؐ، سیرتِ صحابہؓ، اللہ تعالیٰ کا نظامِ عدل، اسلامی معیشت، انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر، احکام السلطانیہ وغیرہ ہوں، طلباء ان میں سے انتخاب کریں۔

۲۵۔ سائنس گروپ میں 'یورپ پر اسلام کے احسانات' میڈیکل گروپ میں 'طبِ نبوی اور جدید سائنس' اور کامرس گروپ میں 'اسلام اور جدید معیشت و تجارت' کے موضوع پر کتب کو شامل نصاب کیا

جائے۔

۲۶۔ علمی وفنی ڈگری کے حصول کے لیے سخت نگرانی کے تحت سال میں دو دفعہ امتحان لیے جائیں لیکن

علامہ احمد جاوید صاحب کے ہاں ہر جمعہ کو بعد نماز مغرب عامۃ الناس کے لیے ایک تربیتی نشست ہوتی ہے جس میں آج کل وہ کسی موضوع پر ریاض الصالحین سے منتخب احادیث کا مطالعہ کر کے اس پر کچھ گفتگو کرتے ہیں۔ البرہان نے ان مجالس کی روداد افادۂ عام کے لیے طبع کرنے کا پروگرام بنایا ہے۔ اس طرح کی ایک نشست کی جزوی گفتگو حاضر خدمت ہے۔ امین

طلباء کے لیے ایک ڈگری کے بعد دوسری ڈگری (میٹرک کے بعد ایف اے) کا امتحان دینے کے لیے کسی قسم کے وقفہ (عموماً دو سال) کی شرط ختم کی جائے۔ اس کو اپنانے سے طلباء سیاسی و مذہبی سرگرمیوں میں وقت ضائع نہیں کریں گے بلکہ اپنی صلاحیتوں کو تعلیمی میدان میں ایک دوسرے سے سبقت حاصل کرنے میں صرف کریں گے۔ ہمارے اسلاف کی زندہ و تابندہ روایات موجود ہیں کہ انہوں نے اٹھارہ سال کی عمر میں مختلف قسم کے علوم وفنون حاصل کیے پھر تدریسی دور میں تصنیف و تالیف کے ذریعے علمی دنیا میں اپنا نام روشن کیا (بشکریہ الاعتصام ۱۴۱۷ھ)۔

تزکیۂ نفس

علامہ احمد جاوید

حسنِ معاشرت

حضرت ہشام بن حکیم بن حزامؓ بیان کرتے ہیں کہ ان کا شام میں کچھ عجمی کاشت کاروں پر سے گزر ہوا جنہیں دھوپ میں کھڑا گیا گیا تھا اور ان کے سروں پر زیتون کا تیل بہایا گیا تھا۔ انہوں نے پوچھا: یہ کیا ماجرا ہے؟ انہیں بتایا گیا کہ انہیں خراج کی عدم ادائی کی وجہ سے سزا دی جارہی ہے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ انہیں جزیے کی وجہ سے قید کیا گیا ہے۔ حضرت ہشامؓ نے فرمایا: میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ''اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو عذاب دے گا جو دنیا میں لوگوں کو عذاب دیتے ہیں۔'' پھر حضرت ہشامؓ وہاں کے گورنر کے پاس گئے اور اسے یہ حدیث سنائی تو گورنر نے ان لوگوں کو چھوڑ دیا۔ (صحیح مسلم، کتاب البر والصلة والادب، باب الوعید الشدید لمن عذب الناس بغیر حق، حدیث: ۲۶۱۳)

رسول کریم ﷺ نے جن بہت سی چیزوں کی تاکید فرمائی ہے ان میں سے دو بہت اہم ہیں۔ ایک کا تعلق اللہ سے ہے اور دوسری کا مخلوق سے۔ یعنی اللہ کے ساتھ بھی اچھے رہو (اُس کی شان اور اپنی حیثیت کے مطابق) اور مخلوق کے ساتھ بھی۔

اس حدیث میں آپ ﷺ نے جو یہ فرمایا کہ دنیا میں جو آدمی کسی کو عذاب دے گا اللہ تعالیٰ قیامت والے دن اسے بھی عذاب میں مبتلا کرے گا، یہ اس معاشرت کی کنجی ہے جو رسول اللہ ﷺ ہمارے درمیان قائم کرنے کے لیے تشریف لائے تھے۔ اس کو ہم جتنا پھیلاتے چلے جائیں ہماری معاشرت کی خرابیاں دور ہوتی چلی جائیں گی۔ جو مخلوق کو تکلیف پہنچائے اس کا ناقص الایمان ہونا یقینی ہے۔ اور اس شخص کی آخرت کی بربادی میں کوئی شبہ نہیں جس نے اپنے رویے، اپنے عمل یا اپنے خیالات کے ذریعے مخلوق کو اذیت، تکلیف، پریشانی یا گمراہی میں ڈالا۔

جس بات کا آپ ﷺ اپنے خدام کی معاشرت میں اہتمام فرماتے تھے اور جس پر عام سے عام آدمی بھی کامیابی کے ساتھ پورا اتر سکتا ہے وہ یہ ہے کہ ہر آدمی کو کوشش کرنی چاہیے کہ دوسروں کو اس سے راحت ملے خواہ اس عمل سے خود اسے کچھ تکلیفوں ہی کا سامنا کرنا پڑے۔ یہ ان لوگوں کی علامت ہے جو کسی بھی معاشرے کا جوہر ہوتے ہیں۔ معاشرے میں دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں ایک وہ جو معاشرے کے آئیڈیلز یعنی خیر کی اعلیٰ صورتوں کو عمل میں لاتے ہیں اور دوسرے وہ جو خیر کی موجودہ صورتوں کی خلاف ورزی نہیں کرتے یعنی چاہے وہ خیر کی عمارت تعمیر نہ کرسکیں لیکن خیر کی عمارت جب تعمیر ہورہی ہو تو اس میں رکاوٹ بھی نہیں بنتے اور اگر اس میں کوئی حصہ ڈال سکیں تو جا کر

اپنی جماعت اور اپنے نام کے نعرے نہیں لگاتے۔

آئیڈیل آدمی وہ ہے جس کی زندگی اس مزاج پر گزرے کہ میری سوسائٹی کو اور مجھ سے تعلق رکھنے والوں کو میری ذات سے آرام اور فائدہ پہنچے چاہے مجھے نقصان ہی ہو جائے۔ معاشرت کی جہت سے متبع سنت یہی آدمی ہے۔

لیکن اس آدمی کو بھی آپ ﷺ نے مسلم معاشرے کے لیے قابل قبول قرار دیا ہے جو زندگی اس اصول پر گزارے کہ اگر کسی کو مجھ سے فائدہ نہیں پہنچتا تو کوئی تکلیف بھی نہ پہنچے۔ یہ معاشرت کی بنیاد ہے۔ کیونکہ معاشرت کی بنیادیں آئیڈیلسٹک نہیں ہوتیں۔ معاشرے کو کچھ انجینئرز کی ضرورت ہوتی ہے جو خواص ہوتے ہیں اور کچھ کارکنوں کی ضرورت ہوتی ہے جو اس معاشرے کی اکثریت ہوتی ہے۔ ایک اچھے معاشرے کا کارکن بن کر رہنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اس عہد پر خود کو قائم کریں اور اس کی خلاف ورزی اپنی ذات سے نہ ہونے دیں۔ یہ وہ بنیادی باتیں ہیں جو آپ ﷺ کی سنت معاشرت کو اجتماعی سطح پر پورا کرنے کے لیے درکار ہیں۔

معاشرت کا ایک اور اصول جو اچھے معاشرے کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے وہ ہے انصاف۔ کوئی اچھا معاشرہ اپنے جاری رہنے کا امکان پیدا نہیں کر سکتا جب تک اس میں انصاف نہ ہو۔ لہٰذا ہر معاملے میں حق کے ساتھ کھڑے ہونا چاہیے چاہے اس کی زد کسی پر بھی پڑے۔ یہ انصاف کا خلاصہ ہے کہ حق پر قائم رہو اور حق کے گواہ بنو چاہے اس کا فائدہ تمہارے دشمنوں کو ہو اور نقصان تمہارے دوستوں کو۔

انصاف سے بڑھ کر انسانوں کے درمیان ایسی چیز مشکل سے ملے گی جو انہیں اپنے نفس پر قابو رکھنے میں اتنی مدد دے جتنی حِس انصاف سے ملتی ہے۔ ایک آدمی اگر منصف مزاج ہو تو وہ نوافل میں برسوں لگا دینے والے شخص کے مقابلے میں اپنے نفس پر زیادہ قدرت رکھتا ہے۔ انصاف کا ایک subjective فائدہ یہ ہے کہ انصاف کرنے کی عادت، رویہ، مزاج اور عزم انسان کو اپنے نفس پر قدرت دیتا ہے بلکہ اپنے نفس کے خلاف حق کے میلان کو غالب رکھتا ہے۔

انصاف وہ سیمنٹ ہے جو معاشرے کی اینٹوں کو جوڑ کر سٹرکچر بناتا ہے۔ انصاف کی حیثیت اس گارے کی سی ہے جو افراد کی شکل میں پھیلی ہوئی اینٹوں کو ایک دوسرے سے جوڑ کر ایک اچھے معاشرے کا ڈھانچہ تعمیر کرتا ہے۔ انصاف ہر حال میں حق کے ساتھ کھڑے رہنے کا نام ہے چاہے

مسلمان کو نقصان ہو اور یہودی کو فائدہ۔

تیسری بات یہ کہ حق پر قائم رہنے کے لیے جن ناہموار راستوں پر چلنا پڑتا ہے اور جن ناگوار باتوں سے واسطہ پڑتا ہے ان میں اگر کسی معاشرے کے افراد ایک دوسرے کی مدد کریں تو سمجھیے وہ معاشرہ ابدیت کا فرمان لکھالایا ہے۔ وہ معاشرہ ابدی بننے کی خدا کی ضمانت لے کر آیا ہے جس کے افراد ایک دوسرے کو حق پر ثابت قدم رہنے کے لیے فعال اور بے نفس کمک فراہم کرتے ہوں۔ یعنی تم اپنے بھائی کو کہہ سکو کہ اگر تمہیں بھوک کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے تو پرواہ نہ کرو میں نے بھی حق پر رہنے سے پانچ سال بھوک جھیلی ہے۔ تمہیں ابھی کاروبار میں سود سے بچنا ناگوار لگ رہا ہے تو اس کو جھیل جاؤ اور اس میں اگر کوئی نقصان ہوتا ہے تو ہم ان شاء اللہ تمہارا رزق کفاف کے لیے ساتھ دیں گے یعنی اتنی روزی کے لیے جو زندگی کے لیے ضروری ہو۔ اس کے ہم ضامن ہیں تم فکر نہ کرو اور اپنے ارادۂ خیر پر قائم رہو۔ فرد کو ارادۂ خیر اور عزم حق پر قائم رہنے کے لیے جس طرح کی زبانی، جانی اور مالی کمک کی ضرورت ہوتی ہے اگر کسی معاشرے کے غالب افراد ایک دوسرے کے ایسے مددگار ہوں کہ زبان سے واعظ بھی ہوں، مال سے منفق بھی ہوں اور جان سے مجاہد بھی ہوں تو یہ معاشرہ پھر ایک ایسی دیوار بن جاتا ہے جس کی پانچ دس اینٹیں اگر کچی بھی ہوں تو وہ اس دیوار کے انہدام کا سبب نہیں بنتیں اور یوں معاشرے کا مجموعی سیٹ اپ تبدیل نہیں ہوتا۔

خلاصہ یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سنت کا جوہر ہے حسن معاشرت یعنی افراد معاشرہ کی خیر خواہی اور انہیں نفع پہنچانے کی خواہش و کوشش اور انہیں مشقت میں ڈالنے اور ان کے ساتھ ناانصافی کرنے سے بچنا۔ اگر ہم سمجھیں تو یہی دین کی سپرٹ ہے بلکہ یہی پورا دین ہے۔

تزکیۂ نفس علامہ احمد جاوید

نفاق (منافقت)

حکم ربّانی

۔ ''یٰاَ ☐ یُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝ کَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰہِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ''

(الصّف ۳،۲ : ۶۱)

مومنو! تم ایسی باتیں کیوں کہا کرتے ہو جو کیا نہیں کرتے۔ خدا اس بات سے سخت بیزار ہے کہ ایسی بات کہو جو کرو نہیں۔

۔ ''اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْکِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ وَ لَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِیْرًا'' (النساء ۴:۱۴۵)

کچھ شک نہیں کہ منافق لوگ دوزخ کے سب سے نچلے درجے میں ہوں گے اور تم کسی کو ان کا مددگار نہ پاؤ گے۔

فرمانِ نبوی

۔ ''آیة المنافق ثلاث اذا حدّث کذب، اذا أوتمن خان و اذا وعد اخلف'' (صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب علامات المنافق)

منافق کی تین نشانیاں ہیں، جب بات کرے تو جھوٹ بولے، وعدہ کرے تو اسے پورا نہ کرے اور امانت میں خیانت کرے۔

۔ ''قال رجل لحذیفة رضی اللہ عنہ: یا ابا عبداللہ! ما النفاق؟ فقال: ان تتکلم بالاسلام و لا تعمل به'' (مسند الامام الربیع)

ایک آدمی نے حضرت حذیفہؓ سے پوچھا کہ نفاق کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا: یہ کہ تم زبان سے تو اسلامی تعلیمات کا اقرار کرو لیکن ان کے مطابق عمل نہ کرو۔

س: نفاق کسے کہتے ہیں؟

ج: نفاق کی اصولی تعریف یہ ہے کہ دل اور زبان متفق نہ ہوں۔ اس کی دو بڑی قسمیں اعتقادی نفاق اور عملی نفاق ہیں۔ اعتقادی نفاق ایک قسم کا کفر ہے اور عملی نفاق فسق ہے۔ اعتقادی نفاق کی تعریف یہ ہے کہ آدمی ایمان کا اظہار کرے مگر دل میں ایسا انکار رکھے جو ارادتاً ہو، یا دوسرے لفظوں میں اقرار ظاہر کرنا اور انکار چھپانا جیسا کہ قرآن حکیم میں ہے:

''اِ ☐ ذَا جَآئَکَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِ ☐ نَّکَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ وَ اللّٰهُ یَعْلَمُ اِ ☐ نَّکَ لَرَسُوْلُهٗ وَ اللّٰهُ یَشْهَدُ اِ ☐ نَّ الْمُنٰفِقِیْنَ لَکٰذِبُوْنَ ○ اِتَّخَذُوْٓا اَیْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اِ ☐ نَّهُمْ سَآءَ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ'' (المنافقون ۶۳:۱،۲)

''اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! جب منافق لوگ تمہارے پاس آتے ہیں تو (ازراہ نفاق) کہتے ہیں کہ ہم اقرار کرتے ہیں کہ آپ بے شک خدا کے پیغمبر ہیں اور خدا جانتا ہے کہ درحقیقت تم اس کے پیغمبر ہو لیکن خدا ظاہر کیے دیتا ہے کہ منافق (دل سے اعتقاد رکھنے کے لحاظ سے) جھوٹے ہیں۔ انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے اور ان کے ذریعے سے (لوگوں کو) راہِ خدا سے روک رہے ہیں۔ کچھ شک نہیں کہ جو کام یہ کرتے ہیں بُرے ہیں۔

نفاق عملی یہ ہے کہ دین کے احکام کو ماننے کے باوجود ان پر دانستہ اور اختیاراً عمل نہ کیا جائے جیسا کہ قرآن حکیم نے سورہ الصّف میں ان لوگوں کی نکیر کی ہے جن کے قول وفعل میں تضاد ہو۔

واضح رہے کہ اعتقادی نفاق کفر کی بدترین قسم ہے اور عملی نفاق فسق کی جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ منافق کی نشانی یہ ہے کہ وہ جھوٹ بولتا ہے، امانت میں خیانت کرتا اور وعدے کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ نیز فرمایا:

''لاالٰہ الااللہ کلمۃ الف اللہ بھا قلوب المسلمین۔ فمن قال واتبعھا بالعمل الصالح فھو مومن ومن قالھا واتبعھا بالفجور فھو منافق'' (مسند الامام الربیع)

یعنی لا الٰہ الا اللہ وہ کلمہ ہے جس سے اللہ نے مسلمانوں کے دلوں کو باندھ رکھا ہے پس جس نے یہ کلمہ پڑھا اور نیک عمل کیے تو وہ سچا مومن ہے اور جس نے کلمہ پڑھا اور بُرے اعمال کیے وہ منافق ہے۔

س: نفاق کا ضرر کیا ہے؟

ج: نفاق کا سب سے بڑا ضرر تو اللہ تعالیٰ کی ناراضی اور اس کے نتیجے میں جہنم کی آگ کا عذاب ہے جیسا کہ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ منافقین جہنم کے سب سے نچلے گڑھے میں ہوں گے۔

س: اعتقادی نفاق کا علاج کیا ہے؟

ج: اعتقادی نفاق کا علاج ہمیں درکار نہیں ہے کیونکہ ایک مسلمان کو مسلمان رہتے ہوئے یہ مرض لاحق نہیں ہوتا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اعتقادی نفاق کا حامل خود کو مریض نہیں سمجھتا اس لیے اس کو کوئی علاج بتانا بے سود اور بے معنی ہے۔ البتہ اس نفاق میں مبتلا کسی شخص کو خیر خواہی اور تبلیغ کی نیت سے بعض طریقوں سے سمجھانے اور حق کی طرف مائل کرنے کی کوشش کی جا سکتی ہے۔ اس کا بیان ان شاء اللہ تعالیٰ، آداب تبلیغ میں ہوگا۔

س: عملی نفاق کا علاج کیا ہے؟

ج: عملی نفاق کی دو حالتیں ہیں۔ پہلی حالت تو یہ ہے کہ آدمی اس نفاق میں مبتلا ہو مگر کسی وجہ سے اس کے ضرر کو محسوس نہ کرتا ہو۔ دوسری حالت یہ ہے کہ اس کا شکار تو ہو لیکن اس سے رہائی پانے کی خواہش بھی رکھتا ہو۔

پہلی حالت عموماً دو وجوہ سے پیش آتی ہے: ایک غلط عقائد اور دوسرے حبّ دنیا۔ اس کا علاج اصولاً صحیح عقائد سے شروع ہوگا۔ ایسے شخص کی وہ غلطی دریافت کرنی چاہیے جس کی وجہ سے وہ اپنے نفاق کے نقصانات کی طرف پوری طرح متوجہ نہیں ہو پا رہا۔ عام طور پر اس غلطی کے دو سبب ہوتے

ہیں: ایک اللہ کی رحمت کا غلط تصور؛ اور دوسرے رسول اللہ ﷺ کی شفاعت کا غلط تصور۔ سب سے پہلے یہ باور کرنا اور کرانا چاہیے کہ اللہ کی رحمت اگر آخرت میں بھی نافرمانوں پر ایسی عام ہو کہ بڑے سے بڑا نافرمان بھی بخشا جائے تو اس کا سیدھا سادا مطلب تو یہ ہوا کہ نعوذ باللہ، اللہ کے احکام محض مذاق تھے اور ظاہر ہے کہ یہ بات اللہ تبارک وتعالیٰ کی شان کے اس قدر خلاف ہے کہ خود یہ شخص بھی جو رحمت کا خود ساختہ تصور رکھتا ہو، اسے قبول نہیں کرسکتا۔ دوسرے سبب کا ازالہ بھی اسی نہج پر ہوگا کہ بلاقید اور عام شفاعت رسول کریم ﷺ کی عبدیت ہی نہیں بلکہ رسالت کے بھی منافی ہے کیونکہ اگر اس طرح کی شفاعت آپ ﷺ کو فرمانا تھی تو آپ ﷺ کا اپنی بندگی پر اصرار کوئی معنی نہیں رکھتا اور وہ پیغام بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتا جو آپ ﷺ انسانوں کی اخروی نجات کے واحد ذریعے کے طور پر لے کر آئے۔ باقی رہی حبّ دنیا تو اس کی تعریف اور علاج نفاق کے بعد زیر بحث آئے گا۔

س: اس شخص کے لیے کیا علاج تجویز کیا جائے گا جو عملی نفاق میں مبتلا ہو، اس کے ضرر کو محسوس بھی کرتا ہو اور اس سے بچنا بھی چاہتا ہو؟

ج: اس معاملے میں علاج دراصل دو چیزوں کا ہوگا۔ ایک کسل اور دوسرے آخرت پر مطلوبہ یقین نہ ہونا۔ کسل کے علاج کا آغاز نماز باجماعت کی پابندی سے ہوگا اور رفتہ رفتہ دوسرے معاملات کا بھی احاطہ کرے گا۔ جماعت کی پابندی کسل کی دونوں قسموں یعنی ذہنی اور جسمانی کسل کا علاج ہے۔

آخرت پر مطلوبہ یقین پیدا کرنے کی بہترین تدبیر تو یہ ہے کہ ایسے لوگوں کی صحبت اختیار کی جائے جن کے قول وفعل سے اللہ کا خوف جھلکتا ہو، تاہم اگر اس طرح کی صحبت میسر نہ ہو تو آخرت سے متعلق آیات قرآنیہ، احادیثِ نبویہ یا کوئی مستند بیان باربار پڑھنے کی عادت ڈالی جائے۔ شروع میں اگر دل نہ لگے تو بھی یہ مطالعہ جاری رکھنا چاہیے۔ اس میں کچھ رسوخ پیدا ہو جائے تو پھر موت کو یاد رکھنے کی مشق کرنی چاہیے۔ یہ آخرت کے یقین کو بھی کامل کرتی ہے اور عمل کے محرکات کو بھی تقویت پہنچاتی ہے۔

مسلم نشأۃ ثانیہ اور مغرب　　　ڈاکٹر نعمان ندوی

مسلم ترقی اور سربلندی کے لیے

سائنس وٹیکنالوجی غیراہم ہے (آخری قسط)

نفس پرستی اور نفس کشی کی متضاد روایات ایک ساتھ نہیں چل سکتیں۔ کیا خیرالقرون کے عہد کی کیفیات اس دور کی سادگی اور دنیا سے کم سے کم تمتع کی روایت کے بغیر روحانیت کا منبع کچھ اور بھی ہوسکتا ہے؟ کیا اس جدید تہذیب وتمدن اور طریقوں کو لفظ بہ لفظ ارتقائے زمانہ کے نام پر اختیار کرلیا جائے جس کے نتیجے میں لوگوں کا زندگی بسر کرنا بلکہ مغرب میں لوگوں کا مرنا بھی ناممکن ہوگیا ہے؟ برطانیہ جیسے ملک میں تدفین کی رسومات پر چار پانچ ہزار پونڈ خرچ ہوتے ہیں اس لیے اب تدفین کی رسم کے لیے بھی انشورنس متعارف کرائی گئی ہے۔ صنعتی انقلاب کے نتیجے میں کینسر جیسی کئی موذی اور مہلک بیماریوں کے جدید علاج نے موت کا حصول بھی مشکل بنادیا ہے، کیونکہ علاج سے مرنے کے لیے لاکھوں روپے کی ضرورت ہے۔ سات ہزار سال کی تاریخ میں سترہ تہذیبوں میں جہاں کبھی خود کشی کی روایت نہیں رہی، تاریخ میں پہلی مرتبہ خودکشی جدید طرز زندگی کے طور پر عام ہورہی ہے۔ غربت، معیار زندگی کی آرزو، خوابوں سے بھرپور الف لیلوی پُرتعیش زندگی، چکا چوند سے معمور زرق برق خوابناک طرز حیات جو صرف میڈیا پر دکھائی دیتا ہے جدید ایجادات اور ان کی اشتہار بازی سے مسابقت کی دوڑ میں ناکامی کے باعث بے شمار مہلک دماغی، جسمانی اور روحانی امراض پیدا ہورہے ہیں، ان مہلک امراض کے علاج اتنے مہنگے ہیں کہ زندگی بخوشی ہار دینا اور خودکشی کرلینا زیادہ آسان ہوگیا ہے۔ جو موت قسطوں میں لاکھوں روپے خرچ کرکے ملتی ہو جس کے باعث خاندان، جائیداد، عزتیں اور عورتیں سب بک جاتی ہوں مگر مریض پھر بھی صحت مند نہ ہوتا ہو تو سب کے لیے خودکشی کے راستے کھل جاتے ہیں۔ اسی لیے خودکشی عام ہورہی ہے خواہ وہ دنیا کے غریب علاقے ہوں یا امیر خطے۔ اس کا سبب شاعر عارف شفیق نے صرف دو مصرعوں میں بتادیا ہے:

غریب شہر تو فاقے سے مرگیا لیکن　　امیر شہر نے ہیرے سے خودکشی کرلی

کسی کے پاس کھانے کو روٹی نہیں اور کسی کے پاس کھا کے مرنے کے لیے ہیرا ہے، یہ خدا بے زار معاشروں کا انجام ہے۔

خودکشی صرف غریب آدمی نہیں کررہا، بڑے بڑے امرا بھی کررہے ہیں۔ یہ ان یوروپی ممالک میں بھی ہورہی ہے جہاں آمدنی اور عیاشی سب سے زیادہ ہے، جن کو ہمارے جدیدیت پسند مسلم مفکرین بڑی حسرتوں سے دیکھتے ہیں اور جیسے ہی کسی یورپی ملک سے سفر کرکے آتے ہیں فوراً مدح وثنا سے بھرپور سفر نامے لکھتے اور اسلام سے ٹریفک کا نظام ثابت کرنے لگتے ہیں۔ مغرب میں محبت، خاندان، رشتوں، روابط، مذہب، اقدار اور اخلاقیات کی موت کے باعث لوگوں کی زندگی بے معنی

(meaningless) ہوچکی ہے۔ اس کو معنی دینے کا طریقہ گینیز بک آف ورلڈ ریکارڈ ہے، مگر زندگی پھر بھی بے معنی ہی رہتی ہے۔ نہ خاندان، نہ ماں، نہ بیوی نہ بچے آدمی کس کے لیے جیے، کس کے لیے مرے، کس کے لیے قربانی دے لہٰذا بہتر یہ ہے کہ آدمی اپنے ہی لیے مرجائے۔ ہائیڈیگر کے الفاظ میں یہ ''فاتحانہ موت'' آج مغرب کی پسندیدہ تہذیب ہے جسے تیزی سے مقبولیت حاصل ہورہی ہے۔ عہد حاضر کا سب سے بڑا فلسفی گلز ڈیلوز (Gills Delluze) اس عہد کے مسائل پر سوچتے سوچتے پاگل ہوگیا۔ وہ ان مسائل کا کوئی جواب نہ دے سکا تو اس نے ہسپتال کی کھڑکی سے چھلانگ لگا کر خودکشی کرلی۔ اسے صدمہ ہے کہ انسان ابھی تک آزاد نہیں ہوسکا۔ مساوات کے فلسفے کے باوجود باپ بیٹی اور ماں بیٹے کے رشتوں میں ابھی تک احترام قائم ہے۔ یہ تعلقات ابھی تک مکمل ناپاک نہیں ہوئے۔ اسے شکایت یہ ہے کہ محرمات سے ازدواجی تعلقات (Incestuous relations) عام کیوں نہیں ہوئے۔ حالانکہ مغرب میں مساوات کے فلسفے کے باعث حقیقی خونی رشتوں میں جنسی جبر کی شکایات عام ہیں۔ تاریخ انسانی میں کبھی کسی فلسفی نے اس بے بسی کے ساتھ اپنی جان کا نذرانہ پیش نہیں کیا۔ جدید مغربی تہذیب، اس کی سائنس، ٹیکنالوجی اوراس کے بطن سے پھوٹنے والے مسائل گلز ڈیلوز کی خودکشی کا سبب ہیں۔ سوئٹزرلینڈ، ناروے، سویڈن، جرمنی اس وقت عصری تاریخ کے ترقی یافتہ، امیر، سہولتوں سے آراستہ اور جدید فتوحات سے مزیّن بہت محدود آبادی کے حامل معاشرے ہیں، لیکن سب سے زیادہ خودکشی کی شرح ان خطوں میں ہے تو آخر کیوں؟ مادی ترقی کی معراج پر پہنچنے کے بعد بھی کیا کسی چیز کی ضرورت باقی رہ گئی؟ انسان خودکشی کیوں کرتا ہے؟ کیا اسے خودکشی کرنی چاہیے؟ خودکشی کیوں کی جاتی ہے؟ فلاسفہ کے یہاں اس پر دلچسپ بحث ملتی ہے۔ کانٹ کے خیال میں انسانی ذہن بارہ حصوں میں منقسم ہے۔ ہیگل کے خیال میں ان کی تعداد ۱۰۵ ہے۔ کانٹ کے خیال میں کوئی عقل مند آدمی خودکشی نہیں کرسکتا۔ ہیگل کے خیال میں خودکشی انسان ہی کرتے ہیں جانور کبھی خودکشی نہیں کرتے۔ کیا عہد حاضر کا انسان جانور سے بھی گیا گزرا ہے یا خودکشی کوئی قابل فخر کام ہے۔ عہد حاضر میں زندگی اتنی اذیت ناک کیوں ہوگئی ہے؟

زندگی یقیناً اذیت ناک ہے اس لیے کہ عہد حاضر کے انسان کی آرزوئیں اور تمنائیں میڈیا اور اشتہارات کی صنعت نے بہت بڑھا دی ہیں۔ اس کے نتیجے میں انسان قلت (Scarcity) کے جدید مادی اور روحانی بحران کا شکار ہوگیا ہے جس کا آخری حل خودکشی ہے۔ جزیرۃ العرب کی سخت ترین زندگی میں شب و روز بسر کرنے والے مشرکین نے کبھی خودکشی نہیں کی مگر عہد حاضر کے عیش و

عشرت اور سہولتوں میں آنکھ کھولنے والے وحشی اپنی جان پر کیوں کھیل رہے ہیں؟ وہ کیا بنیادی تغیر واقع ہو گیا ہے کہ اونٹ کی جلتی ہوئی پیٹھ پر بیٹھ کر تپتے ہوئے صحراؤں میں کوک پیپسی اور ٹیٹرا پیک کے دودھ کے بغیر سفر کرنے والا فرد کبھی زندگی سے بے زار نہیں ہوتا تھا۔ عہد حاضر کا عیاش فرد یہ تمام سہولتیں، مراعات اور تعیّشات مل جانے کے باوجود مر جانا چاہتا ہے تو کیوں؟ اگر عہد جدید کے مسلم مفکرین ان باریکیوں، نزاکتوں اور نکتوں سے واقف نہیں تو وہ خطبہ جمعہ سننا ترک کر دیں اور اپنے لیے ہیگل کے جدلیاتی افکار پر مبنی دجل سے نیا خطبہ جمعہ تیار کریں۔ [خودکشی کی تفصیلات کے لیے انٹر نیٹ پر بے شمار معلومات میسر ہیں۔]

حسین نصر اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ہر تہذیب کو سائنسی ترقی اس قوم کے دورِ زوال میں ملی لیکن اس تاریخی تجزیے کو تسلیم کرنے کے بعد وہ مسلمانوں کی سائنسی ترقی کے دور عروج کو ہی اصلاً دور عروج سمجھتے ہیں۔ اسے زوال کی علامت کے طور پر قبول نہیں کرتے اور اس امر پر تعجب کرتے ہیں کہ اس عروج پر زوال کیوں آ گیا؟ اور اس زوال سے عروج کے سفر کا راستہ کیسے نکالا جائے؟ یعنی دنیا کی تاریخ میں تمام تہذیبوں اور اقوام میں مسلمان وہ واحد تہذیب، قوم یا امت ہے جس کو سائنسی ترقی دور زوال میں نہیں مسلمانوں کے دور عروج میں ملی۔ ایک جانب وہ عہد عباسی کو عہد ملوکیت بھی قرار دیتے ہیں، ملوکیت کو تمام گناہوں کی جڑ کہتے ہیں اور اس ملوکیت سے نکلنے والی سائنس کو عظیم اسلامی سرمایہ تسلیم کرتے ہیں اور اس سرمایے کے دوام کے لیے کوشاں رہنے کو مقصود قرآن اور مطلوب رسالت محمدی ﷺ قرار دیتے ہیں۔ ملوکیت کو تمام گناہوں کی جڑ قرار دینا تاریخی طور پر خالص سیاسی، مادی اور دورِ جدید میں خالص مغربی نقطۂ نظر سے ہم آہنگ فکر ہے جو جمہوریت اور جدید مغربی تصور تاریخ سے برآمد ہوا ہے جس کی عمر تین سو سال سے زیادہ نہیں ہے۔ اسلامی تاریخ کو ملوکیت کی تاریخ سمجھنا ردِ عمل کی نفسیات سے برآمد ہونے والا نتیجہ ہے جو جمہوریت کے کفر سے خاص تعلق رکھتا ہے اور حاکمیت جمہور کے ذریعے حاکمیت الہٰ کے تصور کو جڑ بنیاد سے ختم کر دیتا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ یہ نقطۂ نظر اپنی تاریخ کا انکار ہے جو ملت اپنی تاریخ رد کر دے وہ صحرا میں تنہا کھڑی ہوگی اور سراب کی تلاش میں رہے گی۔ حسین نصر کے ان تضادات کی تشریح و توجیہہ کے لیے ہمیں کچھ اور لکھنے کی ضرورت نہیں۔ حسین نصر اور مکتبہ روایت سے وابستہ مفکرین اسلامی سائنس کی نہایت عالمانہ اور پر جوش وکالت کے باوجود یہ نہیں بتا سکے کہ مسلمان کا دور عروج تو عہد رسالت مآب ﷺ اور عہد خلافت راشدہ ہے اور بلا شبہ خیر القرون ہے لیکن اس عظیم عہد اور اس کے بعد خلافت راشدہ

کے زریں ادوار میں سائنس کی ترقی کے لیے کیا لائحہ عمل مرتب کیا گیا؟ اگر نہیں تو کیوں؟ خیر القرون سائنس کی عظیم ترقی سے کیوں خالی رہا؟ کیا علوم نقلیہ اور روحانیت اور شعور ایمانی کے مقابلے میں علوم عقلیہ کی ذرہ برابر بھی وقعت نہیں تھی۔ کبار صحابہ کرام میں کتنے سائنس داں تھے، سائنس کے بغیر ہی مسلمانوں نے تین براعظموں کو کیسے فتح کیا؟ امت مسلمہ کا اصل کردار وہ ہے جب وہ مادی طور پر نہایت ہلکی اور اخلاقی و روحانی طور سے سب پر فضیلت کی حامل تھی یا وہ دور جب اسے دنیا میں مادی طور پر برتری حاصل ہوگئی تھی اگر مادی دور بہتر تھا تو اسی دور میں تاتاریوں جیسی کم زور قوم نے انہیں کیسے شکست دے دی؟ اور اُندلس عظیم سائنسی ایجادات کے باوجود اپنا تحفظ کیوں نہ کرسکا کہ وہاں کوئی مسلمان باقی نہ بچا؟

یہ سوال اہم ہے کہ ہمسایہ اقوام کی مادی ترقی، تہذیب، سائنس اور فنِ تعمیرات سے ام القریٰ کے مسلمان کیوں مرعوب و متاثر نہ ہوئے؟ اور مدینۃ النبی میں ان فنون اور علوم عقلیہ کی درآمد میں کیا امر مانع رہا؟ اس سوال پر بھی غور کی ضرورت ہے کہ مسلمان ہمسایہ اقوام کے علوم عقلیہ اور محیر العقول فلسفہ و سائنس سے اگر مرعوب ہوجاتے تو کیا وہ روم و ایران کو فتح کرسکتے تھے؟ رومی اپنی تمام تر طاقت کے باوجود ایران کو فتح نہ کرسکے لیکن مسلمانوں نے نہ صرف سرزمین ایران کو فتح کرلیا بلکہ اس خطے کے لوگوں کے قلب بھی تسخیر کر لیے اور عظیم الشان رومی سلطنت کا بھی خاتمہ کردیا۔ مسلمانوں کے پاس روم و ایران کی سائنس وٹیکنالوجی کے مقابلے میں صرف ایمان کی قوت تھی۔ ان قوتوں کا خاتمہ کرنے والے ان ختم ہونے والی سلطنتوں کی مادی ترقی، علوم عقلیہ کے مقابلے میں کس حیثیت اور کس مقام کے حامل تھے، یہ جاننے کے لیے تمام مروجہ تاریخوں کا مطالعہ کرلیا جائے۔

کفار مکہ جب ایک امی رسول ﷺ کے معجزانہ کلام کے سامنے عاجز رہ گئے تو انھوں نے یہ اعتراض کیا تھا: ''یہ پرانے لوگوں کی لکھی ہوئی چیزیں ہیں جنھیں یہ شخص نقل کراتا ہے اور وہ اسے صبح و شام سنائی جاتی ہیں''۔ وَقَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا [الفرقان:۵]۔ صرف یہی نہیں بلکہ کفار کو یہ اعتراض بھی تھا کہ یہ کیسا پیغمبر ہے جس کے ساتھ فرشتوں کے لشکر نہیں، جو ہماری طرح بازاروں میں چلتا پھرتا، کھاتا پیتا اور ہم سے ہم کلام ہوتا ہے۔ اسے علم، مال، دولت۔ شان وشوکت یعنی مادی طور پر کسی بھی شے میں ہم پر برتری حاصل نہیں۔ یہ مادہ پرست جس چیز کو علم سمجھتے اور جس منہاج علم میں کھڑے تھے وہاں دنیا اور امور دنیا سے متعلق علوم، یعنی علوم عقلیہ اور مال و دولت ہی راس العلم تھا۔ وہ پیغمبر کو عام انسانوں کی طرح عام لوگوں کے ہم رکاب

دیکھتے تھے تو انھیں حیرت ہوتی تھی۔

ان کا یہ اعتراض بظاہر درست تھا کیوں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے مقرب بندوں کو مافوق الفطرت تصور کرتے تھے۔ جنات کے ساتھ ان کے تعلق کی نوعیت ان کے اکرام کے واقعات جو تاریخ عرب اور کلام عرب میں ملتے ہیں اس نقطۂ نظر کی تشریح میں معاون ہوسکتے ہیں ''یہ کیسا رسول ہے جو کھانا کھاتا اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے کیوں نہ اس کے پاس کوئی فرشتہ بھیجا گیا جو اس کے ساتھ رہتا اور [نہ ماننے والوں] کو دھمکاتا؟ یا اور کچھ نہیں تو اس کے لیے کوئی خزانہ ہی اتار دیا جاتا یا اس کے پاس کوئی باغ ہی ہوتا جس سے یہ [اطمینان کی] روزی حاصل کرتا: وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِي فِي الْاَسْوَاقِ لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا . . . اَوْ يُلْقٰٓى اِلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ تَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ يَّاْكُلُ مِنْهَا وَقَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا [الفرقان: ۷و۸]

وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا [الفرقان: ۳۰]۔''اے میرے رب میری قوم کے لوگوں نے اس قرآن کو نشانہ تضحیک بنا لیا تھا۔'' یہ آیت صرف عہد رسالت کے کفار مشرکین کے لیے نہیں ہے اس عہد کے جدیدیت پسند مسلمانوں کے لیے بھی ہے جنھوں نے اس قرآن کی تضحیک کے نئے نئے طریقے ایجاد کیے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں کہ قرآن کے معنی Hermeneutics سے متعین ہوں گے، کبھی کہتے ہیں کہ کلام عرب سے اخذ ہوں گے، کبھی کہتے ہیں کہ اس کے جو معنی عہد رسالت میں تھے اب وہ نہیں ہیں۔ ان میں جو بہت زیادہ جری ہیں ان کو شکوہ ہے کہ اس قرآن کو لے کر ہم کیا کریں، اس میں نہ نیچرل سائنس ہے، نہ سوشل سائنس، نہ منطق۔ اس کی آیات سے نہ ہم ایٹم بم بنا سکتے ہیں، نہ ہوائی جہاز۔ یہ قرآن عہد حاضر میں کسی کام کا نہیں ہے، نعوذ باللہ۔ دوسری جانب معذرت خواہ، سادہ لوح اور جاہل مفکرین اسی قرآن سے تمام مغربی، مادی، عقلی اور سائنسی علوم کو ثابت کر رہے ہیں مگر اس سوال کا جواب نہیں دیتے کہ عجیب بات ہے کہ قرآن تمھارے پاس تھا اور قرآن میں مستور و مخفی تمام علوم کافروں کو مل گئے جن میں سے کسی ایک سائنس داں نے کبھی بھول کر قرآن نہیں پڑھا اور نہ قرآن کے ذریعے کوئی سائنسی فارمولا دریافت کیا۔

مسلمانوں کی ترقی کا واحد راستہ

اس آنکھوں دیکھی اور خود بیتی کا انکار تو کوئی صاحب ہوش و خرد کر ہی نہیں سکتا کہ مسلمان اس وقت زوال کا شکار ہیں اور ذلت و پستی کے گڑھے میں گرے ہوئے ہیں۔ وہ اس پستی سے نکلنے کے لیے کچھ ہاتھ پاؤں مار بھی رہے ہیں لیکن انہیں ابھی تک اس میں خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی۔ اس تحریر میں ہم اختصار کے ساتھ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ مسلمان کس طرح موجودہ ذلت و پستی سے نکل کر دوبارہ شاہراہ ترقی پر گامزن ہو سکتے ہیں اور اپنی کھوئی ہوئی عظمت کو بحال کر سکتے ہیں!

اگر ہم قرآن و سنت کی روشنی میں قوموں کے عروج و زوال کا جائزہ لیں تو درج ذیل اصول ہمارے سامنے آتے ہیں:

انسان

اس کائنات اور انسان کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے۔ اُس نے انسان کو کائنات میں تصرف کی صلاحیت اور اختیار دیا ہے اور کائنات اسی کے لیے پیدا کی ہے۔ انسان کو اس نے زمین میں قیامت تک کے لیے سامان زیست مہیا کیا ہے تاکہ وہ یہاں بخوبی زندگی گزار سکے۔

ہدایت

انسان کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت سے نوازا ہے اور اسے بتایا ہے کہ زمین میں زندگی کیسے بسر کرے۔ اس نے اپنی ذات کے ادراک کا مادہ انسان میں رکھا ہے اور پیغمبروں کے ذریعے بھی اس کی رہنمائی کی ہے لیکن اس نے بنیادی طور پر انسان کو غیر جانبدار پیدا کیا ہے اور اس کے اندر اچھے اور بُرے دونوں طرح کے میلانات رکھ دیے ہیں اور اسے اختیار دیا ہے کہ وہ چاہے تو ہدایت کو مانے اور چاہے تو نہ مانے اور ماننے اور نہ ماننے دونوں کا انجام بھی بتا دیا ہے۔

دنیا میں کامیابی ہدایت سے مشروط نہیں

دنیا کے تصرف اور اسباب زندگی مہیا کرنے کے کام کو اللہ تعالیٰ نے اپنی ہدایت سے منسلک نہیں کیا یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ قانون نہیں بنایا کہ جو اس کی ہدایت مانے گا اسے وہ زرق دے گا اور جو نہیں مانے گا اسے نہیں دے گا یا جو اسے مانے گا اسے زیادہ رزق دے گا اور جو اسے نہیں مانے گا اسے کم

رزق دے گا بلکہ دنیا گزارنے کے اسباب اس نے سب انسانوں کے لیے یکساں رکھے ہیں خواہ کوئی اس کی ہدایت کو مانے اور مسلم و مطیع ہو یا اس ہدایت کو نہ مانے اور کافر و نافرمان ہو۔

ہدایت کیا ہے؟

اللہ تعالیٰ نے انسان کو دنیا میں زندگی گزارنے کے لیے جو ہدایت اور لائحہ عمل دیا ہے وہ کیا ہے؟ اس کا خلاصہ اس فرمان الٰہی میں ہے کہ اے انسان! میں نے تجھے پیدا کیا ہے اور اس کائنات کو بھی اور تمہیں اس کائنات میں تصرف کا اختیار دیا ہے تو تمہیں چاہیے کہ میری اطاعت کرو، میری مرضی پر چلو۔ تمہارا امتحان یہی ہے کہ تم دنیا کی زندگی میری مرضی کے مطابق گزارتے ہو یا نہیں؟ دنیا کی یہ زندگی عارضی اور چند سالہ ہے اس کے بعد ایک دائمی زندگی آنے والی ہے لہٰذا آخرت کی زندگی کو دنیا کی زندگی پر ترجیح دو اور زندگی گزارنے کا جو طریقہ اور سلیقہ میرے مبعوث کردہ پیغمبروں نے تمہیں بتایا ہے اس پر عمل کرو۔

اطاعت الٰہی کا اخروی نتیجہ

جو انسان اللہ کے احکام کی اطاعت کرتے ہوئے زندگی گزارے گا اسے آخرت میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہوگی اور وہ دائمی نعمتوں سے نوازا جائے گا۔ اس کے برعکس جو شخص دنیوی زندگی اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی کرتے ہوئے گزارے گا وہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کی ناراضی مول لے گا اور سخت سزا کا مستحق ٹھہرے گا۔

اطاعت الٰہی کا دنیوی نتیجہ

اگر انسان اپنی زندگی اللہ کی ہدایت کے مطابق گزاریں گے تو وہ آخرت ہی نہیں دنیا میں بھی کامیاب ہوں گے۔ وہ اسباب زندگی بافراط مہیا کرنے پر قادر ہوجائیں گے اور ان کے درمیان اخوت و محبت کا تعلق پروان چڑھے گا اور یہ زندگی دنیا میں ہی جنت نظیر بن جائے گی۔ تاہم یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ کسی ایک فرد سے نہیں بلکہ انسانی معاشرے سے ہے یعنی جس معاشرے کے افراد کی اکثریت اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی اللہ کے احکام کے مطابق گزارتی ہو وہ دنیا میں بھی کامیاب رہتی ہے۔ تاہم افراد معاشرہ کی اکثریت، خصوصاً اس کے مقتدر عناصر، اگر اللہ کی معصیت پر مبنی زندگی گزاریں تو ظاہر ہے کہ اللہ کی اطاعت کی زندگی بسر کرنے والے شخص یا اشخاص کو ان کی مزاحمت کی وجہ سے مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا اور ایسا فرد بظاہر تو دنیا میں شاید کامیاب نہ ہو لیکن

اس اطمینان قلب سے ضرور متمتع ہوگا کہ اس نے مقدور بھر اللہ کی اطاعت کی ہے اور آخرت میں کامیابی تو یقینا اس کے قدم چومے گی۔

اسلام، کفر اور دنیوی کامیابی

درج بالا گفتگو سے واضح ہوگیا کہ اگر کوئی معاشرہ اسلام یعنی اللہ کی اطاعت کی راہ پر چلے تو اس کے افراد دنیا میں بھی کامیاب ہوں گے اور آخرت میں بھی اور اگر کوئی معاشرہ کفر یعنی اللہ کی عدم اطاعت کے راستے پر چلے تو وہ آخرت میں تو حتماً ناکام ہوگا تاہم وہ دنیا میں کامیاب ہوسکتا ہے اگر وہ اپنی انسانی صلاحیتوں کو منظم کرکے اسباب زندگی مہیا کرنے پر قادر ہوجائے اور اس میں دوسروں سے آگے نکل جائے۔

آج مغرب کیوں کامیاب ہے؟

آج اہلِ مغرب کامیاب ہیں اگرچہ وہ اللہ کی اطاعت کے راستے پر نہیں چل رہے اور دنیوی زندگی گزارنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی رہنمائی کو انہوں نے رد کردیا ہے۔ ان کی کامیابی کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنی صلاحیتوں کو منظم کرکے اسباب زندگی مہیا کرنے پر دوسروں سے بہتر قدرت حاصل کرلی ہے تاہم اس دنیوی کامیابی کے باوجود آخرت میں وہ حتماً ناکام ہوں گے اور اللہ تعالیٰ کے سخت عذاب کے مستحق ٹھہریں گے۔ اور ان کی یہ دنیوی کامیابی بھی عارضی ہے کیونکہ انہوں نے الٰہی ہدایت کو رد کرکے اپنی مرضی کا جو طرز زندگی ایجاد کیا ہے وہ فساد فی الارض کا سبب بن رہا ہے اور یہ فساد دن بدن بڑھ رہا ہے لہٰذا کسی وقت بھی اللہ کی مشیت کا کوڑا حرکت میں آئے گا اور یہ تہذیب عاد وثمود کی طرح نابود ہوجائے گی۔

آج مسلمان کیوں دنیا میں ناکام ہیں؟

آج مسلمان اس لیے دنیا میں ناکام ہیں کہ ان کا معاشرہ اور ان کی اکثریت اللہ کی اطاعت کی زندگی نہیں گزار رہی ۔ اگر وہ اللہ کے احکام کے مطابق زندگی گزار رہے ہوتے تو ان کی انسانی صلاحیتیں بھی بہتر طور پر منظم ہوجاتیں، وہ اسباب زندگی مہیا کرنے پر بھی قادر ہوجاتے اور یوں دنیا میں بھی کامیاب ٹھہرتے۔

تاہم جو مسلمان اپنی ذات کی حد تک مقدور بھر اللہ کی اطاعت پر مبنی زندگی گزار رہا ہو وہ یقینا

آخرت میں کامیاب ہوگا اور دنیا میں اس اطمینان قلب سے بھی متمتع ہوگا کہ اس نے مقدور بھر اللہ کی اطاعت کی کوشش کی۔ البتہ دنیا کی زندگی میں اسے مشکلات وتکالیف اور اللہ کے نافرمان معاشرے کی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑے گا اور دنیا میں اس کا حشر وہی ہوگا جو اس کے معاشرے کا ہوگا۔

مسلمان وہ شخص ہے جو اسلام لایا ہو اور اسلام کا مطلب ہے اللہ کے آگے سر تسلیم خم کردینا اور اس کی اطاعت کرنا۔ اب جو شخص کہتا ہے کہ وہ مسلمان ہے لیکن عملاً اطاعت نہیں کرتا بلکہ کفر کی ہی روش اختیار کرتا ہے تو وہ منافق ہے اور نفاق کے اس رویے کی بناء پر آخرت میں اس کی ناکامی تو ظاہر ہی ہے دنیا میں بھی اگر کسی معاشرے میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہو تو وہ دنیا میں بھی ناکام ہوجائیں گے کیونکہ احکام الٰہی کی عدم اطاعت کا رستہ اختیار کرنے کی وجہ سے وہ اس قوت سے محروم ہوجائیں گے کہ اپنی انسانی صلاحیتوں کو منظم کرسکیں اور اسباب زندگی مہیا کرنے پر قادر ہوسکیں۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان آج دنیا میں ذلیل وخوار ہورہے ہیں۔

آج مسلمان کس طرح دنیا میں کامیاب ہوسکتے ہیں؟

مسلمانوں کے پیش نظر محض دنیا کی نہیں بلکہ دنیا و آخرت دونوں کی کامیابی ہوتی ہے اور دنیا و آخرت دونوں میں کامیابی کا طریقہ یہی ہے کہ دنیوی زندگی اللہ کے احکام کے مطابق گزاری جائے۔ اس سے نہ صرف آخرت میں کامیابی یقینی ہوجائے گی بلکہ انسانی صلاحیتوں کے بہتر استعمال کی وجہ سے مسلمان اسباب دنیا مہیا کرنے میں بھی دوسروں سے آگے نکل جائیں گے۔

کیا مسلمان مغرب کی پیروی کرکے دنیا میں ترقی کرسکتے ہیں؟

اہل مغرب نے چونکہ اللہ کی اطاعت کے راستے کو رد کردیا ہے اور ان کے پیش نظر صرف دنیا کی کامیابی ہے لہٰذا مسلمان اگر ان کی پیروی کریں گے تو ان کی طرح وہ بھی آخرت میں ناکام رہیں گے کیونکہ مغرب کے پیش نظر آخرت کی کامیابی ہے ہی نہیں۔

جہاں تک دنیوی کامیابی کا تعلق ہے، جس کا انحصار انسانی صلاحیتوں کی بہتر تنظیم اور اسباب زندگی مہیا کرسکنے کی قوت پر ہے تو مسلمانوں کو اس کے لیے بھی مغرب کی پیروی کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا راستہ اختیار کرنے سے یہ دونوں صلاحیتیں خودبخود انہیں حاصل ہوجائیں گی جیسا کہ اسلامی تاریخ کے ابتدائی دور میں انہیں حاصل ہوئی تھیں۔

منطقی بات یہ ہے کہ مسلمان مغرب کی پیروی کریں گے تو نہ صرف اپنی آخرت برباد کرلیں گے بلکہ ان کا دنیوی زوال بھی مزید گہرا ہوجائے گا کیونکہ ان کا سارا نظام فکر وعمل اللہ کی اطاعت پر مبنی ہے اور مغرب کا سارا نظام فکر وعمل اللہ کی عدم اطاعت پر مبنی ہے۔ لہٰذا مغرب کی پیروی سے ان کے اندر کشمکش شروع ہوجائے گی اور انہیں کبھی فکر وعمل کی وہ یکسوئی حاصل نہ ہوگی جو دنیوی ترقی کی بنیاد ہے۔ بلکہ اس کشمکش سے فکری اور نظری انارکی پیدا ہوگی جو ایک منتشر شخصیت کو جنم دے گی اور اس کے نتیجے میں مغرب کی پیروی کرنے والے مسلم معاشرے مزید کمزوری کا شکار ہوں گے اور زوال کی دلدل میں مزید گہرے دھنستے چلے جائیں گے۔ ترکی اور ایران کی مثال ہمارے سامنے ہے کہ وہ عرصۂ دراز تک مغرب کی پیروی کے باوجود دنیوی طور پر دیگر مسلم ممالک سے زیادہ خوشحال نہیں ہوئے۔ اس کے مقابلے میں جاپان اور کوریا کو دیکھیے کہ انہوں نے مغرب کی پیروی کی اور دنیوی خوشحالی حاصل کرلی کیونکہ ان کے ہاں مغربی فکر ونظر سے کشمکش کی یہ صورت موجود نہ تھی۔ تیسری مثال ملائشیا کی ہے جس نے اپنے اصولوں پر عمل کرتے ہوئے اور مغرب کی پیروی کیے بغیر ترقی کی کوشش کی تو اسے کامیابی ہوئی۔

خلاصۂ بحث

دنیا میں مسلمانوں کی ترقی اور کامیابی کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ وہ سچ مچ اللہ کی اطاعت کا راستہ اختیار کرلیں اور منافقت و دوعملی چھوڑ دیں۔ اس طرح ان کی انسانی صلاحیتوں کی بہتر نشوونما ہوگی اور وہ دوسروں سے بہتر انداز میں اسباب زندگی مہیا کرنے پر قادر ہوجائیں گے۔ اس سے نہ صرف انہیں دنیا میں سربلندی حاصل ہوگی بلکہ آخرت میں بھی کامیابی انہی کے حصے میں آئے گی۔ اس کے برعکس اگر انہوں نے دنیوی ترقی کے لیے مغرب کی پیروی کا راستہ اختیار کیا تو مغرب کے فکر ونظر سے اساسی اختلاف کی وجہ سے (کہ مغرب کا سارا فکری ڈھانچہ اللہ کی عدم اطاعت پر مبنی ہے) مسلمانوں کے اندر فکری اور نظریاتی کشمکش شروع ہوجائے گی جو ان کی شخصیت کو مضمحل کردے گی جس کے نتیجے میں نہ ان کی انسانی صلاحیتوں کی بہتر نشوونما ہوسکے گی اور نہ وہ اسباب زندگی احسن انداز میں حاصل کرنے پر قادر ہوسکیں گے اور یوں وہ دنیوی ترقی وکامیابی سے مزید دور ہوجائیں گے۔ مغرب کی پیروی سے مسلمانوں کی اخروی کامیابی کی منزل بھی کھوٹی ہوگی کیونکہ مغرب کے سارے نظام فکر و

عمل میں آخرت اور اللہ کی اطاعت کا کوئی تصور موجود ہی نہیں۔

چونکہ اسلام اور مغرب کے نظام فکر و عمل میں بنیادی تضادات ہیں لہٰذا ان میں ہم آہنگی پیدا ہو ہی نہیں سکتی۔اس لیے یہ تصور ممکن ہی نہیں کہ مسلمان بیک وقت اچھے مسلمان بھی رہیں اور مغرب کی پیروی کر کے دنیوی ترقی اور کامیابی بھی حاصل کر لیں۔ لہٰذا اگر مسلمان دنیا میں ترقی کرنا چاہتے ہیں اور کامیابی حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اس کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ انہیں صحیح اور اچھا مسلمان بننا پڑے گا۔

ترقی کے دنیاوی اسباب و وسائل

سطور بالا میں ہم نے دو اصولی باتوں کا ذکر کیا ہے، ایک یہ کہ مسلمان صرف اسلامی اصولوں پر عمل کر کے ترقی کر سکتے ہیں اور دوسرے یہ کہ وہ مغربی تہذیب کی پیروی کر کے ترقی نہیں کر سکتے۔ پہلے اصول کی وضاحت کرتے ہوئے ہم نے یہ بات بھی کہی تھی کہ اسلامی اصولوں پر عمل مسلمانوں کی ترقی کا ضامن اس لیے ہے کہ اس سے ان کے اندر ان اسباب و وسائل کے حصول کی وہ صلاحیت خود بخود پیدا ہوجائے گی جو دنیوی ترقی کا زینہ ہیں۔ممکن ہے بعض قارئین کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ دنیاوی ترقی کے وہ اسباب و وسائل ہیں کیا؟ لہٰذا ہم ان کی خدمت میں عرض کرتے ہیں کہ یہ وسائل تین قسم کے ہیں:

۱۔ نموئی (Developmental) وسائل ۲۔ انسانی (Human) وسائل

اور ۳۔ مادی (Material) وسائل

نموئی وسائل:

۱۔ تعلیم و تربیت ۲۔ تحقیق ۳۔ سیاسی استحکام ۴۔ قوت ابلاغ

انسانی وسائل:

۱۔ محنت ۲۔ اتحاد ۳۔ تنظیم و منصوبہ بندی ۴۔ پابندئ قانون ۵۔ ایثار و قربانی

مادی وسائل:

۱۔ سائنس و ٹیکنالوجی ۲۔ معاشی مضبوطی ۳۔ حربی قوت

ان وسائل و اسباب کے حوالے سے دو اہم باتیں ذہن میں رہنی چاہئیں۔ ایک تو یہ کہ یہ اسباب

معروضی اور عالمی نوعیت کے ہیں یعنی ان پر جو عمل کرے گا وہ دنیا میں کامیاب ہوجائے گا خواہ وہ مسلمان ہو یا کافر۔ دوسرے یہ کہ انسانوں میں ان وسائل کے حصول کی صلاحیت کے پیدا ہونے کا انحصار اپنے نظریۂ حیات سے کمٹمنٹ پر ہے۔ کیونکہ اپنے نظریۂ حیات سے کمٹمنٹ ہی انسانوں کو وہ قوت محرکہ اور صلاحیت مہیا کرتی ہے جو انہیں دنیا میں ان اسباب ترقی کے حصول پر قادر بناتی ہے۔

اب ان دو اصولوں پر عمل کے حوالے سے مسلمانوں کا اور مغرب کا جائزہ لے لیجیے۔ مغرب اپنے نظریۂ حیات (سیکولرزم، ہیومنزم، میٹریلزم وغیرہ) سے شدت سے وابستہ ہے اور اس پر پوری طرح عمل کر رہا ہے اس لیے وہ ان اسباب کے حصول پر قادر ہو گیا ہے اور اس نے ترقی وعروج حاصل کر لیا ہے۔ اس کے برعکس مسلمانوں نے اپنے نظریۂ حیات (اسلام) پر عمل چھوڑ دیا ہے لہٰذا ان کے اندر وہ قوت محرکہ اور وہ صلاحیت کمزور ہو گئی ہے جس سے وہ ان اسباب ترقی کے حصول پر قادر ہوتے لہٰذا وہ زوال کا شکار ہو گئے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ مسلمانوں کے لیے ترقی کا واحد راستہ صرف یہ ہے کہ وہ اپنے نظریۂ حیات سے عملاً وابستہ ہو جائیں تا کہ ان کے اندر ان اسباب دنیا کے حصول کی قدرت پیدا ہو جائے۔

رہا یہ سوال کہ اسلامی اصولوں پر عمل سے ان اسباب کے حصول کی صلاحیت کیسے پیدا ہوتی ہے؟ یا ان وسائل ترقی کا استنباط قرآن وسنت سے کیسے ہوتا ہے؟ یا مذکورہ نقطۂ نظر سے ہر شعبہ زندگی میں اصلاح کے لیے کن اقدامات کی ضرورت ہے؟ تو یہ ایک تفصیلی بحث ہے جس کے لیے دیکھیے ہماری کتاب 'مسلم سأة ثانیہ ـــــ اساس اور لائحہ عمل' اور 'اسلام اور تہذیب مغرب کی کشمکش'۔

تعارف کتاب　　　　پروفیسر ارشد جاوید

مسلمانوں کا ہزار سالہ عروج

شمع جلتی رہے

البرہان محض ایک جریدہ نہیں ایک مشن ہے۔ اگر آپ کو اس کے مضامین سے دلچسپی ہے تو کوشش کیجیے کہ یہ شمع جلتی رہے اور یہ شمع تبھی جلتی رہے گی جب آپ اس میں اپنے حصے کا تیل ڈالتے رہیں گے۔ خود بھی البرہان کے خریدار بنئے اور دوسروں کو بھی بنائیے۔

زرِاعانت سالانہ 400روپے   تاحیات5000روپے   خصوصی تعاون 10,000 روپے

نام.. پتہ..

فون نمبر..

چیک بنام ارقم فاؤنڈیشن اور منی آرڈر بنام ایڈیٹر، 136 نیلم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور بھجوائیے۔

سیاسی، سائنسی، طبی، علمی
وہ دور اب بھی آسکتا ہے

البرہان اب آن لائن بھی دستیاب ہے

البرہان کے شمارے اب آن لائن بھی دستیاب ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں:

www.safa.edu.pk

سراج محمود ناصر
0300-4609522

اس کتاب کے مؤلف پروفیسر ارشد جاوید صاحب اگرچہ ماہر نفسیات کے طور پر معروف ہیں لیکن وہ نہ صرف استاد ہیں بلکہ اسلامی درد رکھنے والے دانشور بھی ہیں جو امت مسلمہ کی نشأۃ ثانیہ کی آرزو

رکھتے ہیں۔ یہ کتاب انہوں نے اسی جذبے سے مرتب کی ہے کہ اپنے ہم وطنوں کو بتا سکیں کہ ہم وہ امت ہیں جس کے اسلاف نے اسلام کے سنہری اصولوں پر عمل کر کے ایک ہزار سال تک دنیا میں اپنی برتری اور بالادستی کے جھنڈے گاڑے ہیں اور یہ تفوق محض سیاسی اور حربی نہ تھا بلکہ مسلم تہذیب نے زندگی کے ہر شعبے میں نمایاں کامیابیاں حاصل کیں، خصوصاً سائنس اور ٹیکنالوجی کے شعبے میں۔

اس کتاب کے آغاز میں پروفیسر صاحب نے مسلمانوں کے سیاسی عروج، ان کی علم دوستی، سائنسی ترقی میں ان کے کردار اور ایجادات و انکشافات میں ان کے انہاک و کارکردگی کے ذکر کے بعد ہر شعبۂ علم میں ان کی پیش رفت کے ثبوت اور تفصیلات فراہم کی ہیں اور کیمسٹری، فزکس، میکانیات، معدنیات، نباتات، زراعت، حیوانات، ریاضیات، فلکیات، جغرافیہ، میڈیسن، تاریخ نویسی، فلسفہ، ادب، علم موسیقی، تعمیرات اور جہاز رانی کے بارے میں الگ الگ بحث کی ہے۔

اس کتاب کے ذریعے پروفیسر صاحب نے امت کو عموماً اور نوجوانوں کو خصوصاً یہ پیغام دیا ہے کہ مسلمانوں کی ترقی وعظمت کا وہ دور پھر لوٹ کر آ سکتا ہے اگر وہ ازسرنو اپنے نظریۂ حیات سے سنجیدگی سے وابستہ ہو جائیں اور علم دوستی، مطالعہ و تحقیق اور محنت کو اپنا شعار بنالیں۔

یہ کتاب اس قابل ہے کہ ہر مسلمان نوجوان اس کا مطالعہ کرے اور یہ ہر لائبریری میں موجود ہو تاکہ نئی نسل نہ صرف اپنے ماضی پر فخر کرنا سیکھے بلکہ اسے اپنے مستقبل کے لیے زادِ راہ بھی بنا سکے۔ ۱۹۲ صفحات کی اس کتاب کی قیمت ۲۰۰ روپے ہے اور یہ علم و عرفان پبلیشرز، الحمد مارکیٹ، ۴۰۔ اردو بازار لاہور سے مل سکتی ہے۔